الرسالہ

سرپرست

مولانا وحیدالدین خاں

روزہ اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کی مشق ہے
کھانے پینے میں بھی اور دوسرے معاملات میں بھی

شمارہ ۱۰۳

جون ۱۹۸۵

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحیدالدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	30/-	ایمانی طاقت	3/-
تذکیر القرآن جلد اوّل	80/-	اتحادِ ملت	3/-
الاسلام	25/-	سبق آموز واقعات	3/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-	زلزلۂ قیامت	4/-
ظہورِ اسلام	25/-	حقیقت کی تلاش	3/-
احیاءِ اسلام	20/-	پیغمبرِ اسلام	2/-
پیغمبرِ انقلاب	25/-	حقیقتِ حج	2/-
سوشلزم اور اسلام	25/-	آخری سفر	3/-
صراط مستقیم	25/-	اسلامی دعوت	3/-
اسلامی زندگی	20/-	خدا اور انسان	3/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-	حل یہاں ہے	3/-
دین کیا ہے	2/-	سچا راستہ	2/-
قرآن کا مطلوب انسان	5/-	دینی تعلیم	3/-
تجدید دین	3/-	حیاتِ طیبہ	3/-
اسلام دینِ فطرت	3/-	باغِ جنت	3/-
تعمیرِ ملت	3/-	نارِ جہنم	3/-
تاریخ کا سبق	3/-	تبلیغی تحریک	12/-
مذہب اور سائنس	5/-	دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عقلیاتِ اسلام	2/-	عقل کا فیصلہ	
فسادات کا مسئلہ	2/-	کاروانِ اسلام	
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-	رازِ حیات	
تعارفِ اسلام	3/-	The Way to Find God	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	3/-	The Teachings of Islam	5/-
راہیں بند نہیں	3/-	The Good Life	5/-
		The Garden of Paradise	5/-
		The Fire of Hell	5/-
		Muhammad: The Ideal Character	3/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

اردو ، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

جون ۱۹۸۵ ☐ شمارہ ۱۰۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قیمت فی پرچہ	۳ روپیہ
زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	دو سو روپے
بیرونی ممالک سے :	
ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

الرسالہ کے لیے بنک سے رقم بھیجتے ہوئے
بنک ڈرافٹ پر صرف الرسالہ منتھلی AL-RISALA MONTHLY لکھیں۔

ماہنامہ الرسالہ
سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

کامیابی کی فہرست

سید محمد کیرلا میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم لندن میں ہوئی۔ ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کو دیکھ کر ان کے ۸۰ سالہ انگریز استاد پروفیسر سٹیونس (Dr. Cleveland Stevans) نے ۱۹۵۷ میں کہا تھا کہ اے نوجوان شخص، ایک دن تم یہاں اپنے ملک کے نمائندہ بن کر آؤ گے۔ مگر میں اس وقت تم کو دیکھنے کے لئے موجود نہ ہوں گا:

Young man, one of these days you will come here to represent your country. But I would not be there to see you.

یہ پیشین گوئی ۲۳ سال بعد پوری ہوئی۔ اور مسٹر سید محمد ہندستان کے ہائی کمشنر بن کر لندن گئے۔

سید محمد نے بیرسٹری سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ اس کے بعد انھیں بہت سے اعلیٰ عہدے ملے۔ وہ اقوام متحدہ میں ہندستان کے مندوب تھے۔ کیرلا کابینہ میں وزیر ہوئے۔ مائناریٹیز کمیشن کے چیرمین مقرر ہوئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ سید محمد کے خاص دوستوں میں ایک مسٹر خوش ونت سنگھ بھی تھے۔ انھوں نے سید محمد کے بارہ میں ایک مضمون لکھتے ہوئے اس کو اس پیراگراف پر ختم کیا ہے:

Seyid's passions were politics and law. He had applied for the Congress-I ticket to fight the last Parliamentary elections. Going by his records he would have undoubtedly won it. Kerala State Congress bosses denied him the ticket. It broke Seyid's heart and a month later the setback took his life.

سید محمد کا شوق سیاست اور قانون تھا۔ انھوں نے کانگرس آئی کے ٹکٹ کے لئے درخواست دی تھی تاکہ حالیہ پارلمنٹری الکشن میں لڑ سکیں۔ اپنے حالات کے لحاظ سے وہ ضرور کامیاب ہوتے۔ کیرلا ریاستی کانگرس کے ذمہ داروں نے انھیں ٹکٹ دینے سے انکار کیا۔ اس واقعہ نے سید محمد کا دل توڑ دیا اور ایک ماہ بعد اس حادثہ نے ان کی زندگی لے لی (ہندستان ٹائمس ۲۳ مارچ ۱۹۸۵)

آج انسان کامیابیوں کی فہرست میں صرف ایک کمی کو برداشت نہیں کر پاتا۔ حالانکہ انسان پر وہ دن آنے والا ہے جب کامیابیوں کی پوری فہرست اس سے چھن جائے گی۔ کیسا عجیب ہوگا وہ دن اور کیسا عجیب ہوگا اس دن انسان کا حال۔

پابند زندگی کی مشق

عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الصيام جنة فاذا كان يوم صوم احدكم فلا يرفث يومئذ ولا يصخب فان شاتمه احد او قاتله فليقل انى صائم انى صائم (اخرجه البخاری ومسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ روزہ ڈھال ہے پس جب تم میں سے کسی کا روزہ کا دن ہو تو وہ نہ فحش کلامی کرے اور نہ شور کرے۔ اور اگر کوئی شخص اس کو برا کہے یا اس سے لڑائی کرے تو اس کو چاہئے کہ وہ کہہ دے کہ میں روزہ دار ہوں، میں روزہ دار ہوں۔

عن ابی عبيدة بن الجراح قال سمعت النبی صلی الله عليه وسلم يقول: الصوم جنة ما لم يخرقها (اخرجه النسائی)

حضرت ابوعبیدہ نے فرمایا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ روزہ ڈھال ہے جب تک آدمی اس کو نہ توڑے۔

روزہ خواہشات پر روک لگانے کی مشق ہے۔ رمضان کے مہینہ میں اس کی مشق اس آخری حد پر کوئی جاتی ہے کہ کھانا پینا جیسی ضروری چیزوں کے استعمال سے بھی روک دیا جاتا ہے۔ کھانا پینا انسان کے لئے عین جائز ہے۔ مگر روزہ کے دنوں میں اس پر بھی پابندی لگادی جاتی ہے تاکہ دنیا میں پابند زندگی گزارنے کی اہمیت کا شدید احساس پیدا ہو۔

روزہ کا یہ مقصد اگر آدمی کے ذہن میں تازہ ہو تو وہ اشتعال کے مواقع پر مشتعل ہونے سے بچے گا۔ کیونکہ روزہ اپنے آپ پر کنٹرول کرنے ہی کا تو سبق ہے۔ پھر روزہ رکھتے ہوئے وہ اپنے آپ کو کنٹرول سے باہر کیسے لے جاسکتا ہے۔

اس طرح کا شدید سبق ہر سال کے ایک مہینہ میں عملی طور پر دلایا جاتا ہے۔ اگر آدمی صحیح شعور اور جذبہ کے ساتھ روزہ رکھے تو ایک مہینہ کی اس تربیت کا اثر اس کی بارہ مہینہ کی زندگی تک باقی رہے گا۔ تربیت کے دوران جب اس نے اپنے آپ کو تھاما تھا۔ جب وہ اشتعال کے باوجود مشتعل نہیں ہوا تھا۔ تو تربیت کے بعد یقیناً اس کے اوپر اس کے اثرات باقی رہیں گے۔ لوگ اس کو بقیہ مہینوں میں بھی "روزہ دار" پائیں گے۔ جس طرح انھوں نے اس کو رمضان کے مہینہ میں روزہ دار پایا تھا۔

خدا کا ثبوت

اگر ایک انسان کا وجود ہے تو ایک خدا کا وجود کیوں نہیں۔ اگر ہوا اور پانی، درخت اور پتھر، چاند اور ستارے موجود ہیں تو ان کو وجود دینے والے کا وجود مشتبہ کیوں ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تخلیق کی موجودگی عمل تخلیق کا ثبوت ہے۔ اور انسان کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں ایک ایسا خالق موجود ہے جو دیکھے اور سنے۔ جو سوچے اور واقعات کو ظہور میں لائے۔

اس میں شک نہیں کہ خدا ظاہری آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ اس دنیا کی کوئی بھی چیز ظاہری آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتی۔ پھر کسی چیز کو ماننے کے لئے دیکھنے کی شرط کیوں ضروری ہو۔

آسمان پر ستارے جگمگاتے ہیں۔ عام آدمی سمجھتا ہے کہ وہ ستاروں کو دیکھ رہا ہے۔ حالانکہ خالص علمی اعتبار سے یہ صحیح نہیں۔ جب ہم ستاروں کو دیکھتے ہیں تو ہم ستاروں کو براہ راست نہیں دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ بلکہ ان کے ان اثرات کو دیکھ رہے ہوتے ہیں جو ستاروں سے چلا ہوکر کروروں سال کے بعد ہماری آنکھوں تک پہنچے ہیں۔

یہی تمام چیزوں کا حال ہے۔ اس دنیا کی ہر چیز جس کو انسان " دیکھ " رہا ہے۔ وہ صرف بالواسطہ طور پر اسے دیکھ رہا ہے۔ براہ راست طور پر انسان کسی چیز کو نہیں دیکھتا۔ اور نہ اپنی موجودہ محدودیت کے ساتھ کبھی دیکھ سکتا۔

پھر جب دوسری تمام چیزوں کے وجود کو بالواسطہ دلیل کی بنیاد پر مانا جاتا ہے تو خدا کے وجود کو بالواسطہ دلیل کی بنیاد پر کیوں نہ مانا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا اتنا ہی ثابت شدہ ہے جتنا کہ اس دنیا کی کوئی دوسری چیز۔ اس دنیا کی ہر چیز بالواسطہ دلیل سے ثابت ہوتی ہے۔ اس دنیا میں ہر چیز اپنے اثرات کے ذریعہ سے پہچانی جاتی ہے۔ ٹھیک یہی نوعیت خدا کے وجود کی بھی ہے۔

خدا یقیناً براہ راست ہماری آنکھوں کو دکھائی نہیں دیتا۔ مگر خدا اپنی نشانیوں کے ذریعہ یقیناً دکھائی دیتا ہے۔ اور بلاشبہ خدا کے علمی ثبوت کے لئے یہی کافی ہے۔

چھت گرپڑی

۱۹۶۸ کا واقعہ ہے۔ میں اعظم گڈھ کی ایک دکان میں داخل ہوا۔ وہاں میرے ایک جانے پہچانے بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان کو سلام کیا۔ مگر انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے دوبارہ سلام کیا۔ مگر میں نے دیکھا کہ اب بھی وہ خاموش ہیں۔ وہ میری طرف دیکھ رہے تھے مگر کچھ بول نہیں رہے تھے۔ "کیا یہ کوئی دوسرے صاحب ہیں" میں نے سوچا۔ مگر میری آنکھیں اس شبہہ کی تردید کر رہی تھیں۔ جو شخص میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا وہ یقینی طور پر وہی شخص تھا جس کو میں پندرہ سال سے جانتا ہوں۔ بظاہر یہ بھی ناممکن تھا کہ وہ مجھ کو بھول گئے ہوں۔

دکان کے مالک کو جلد ہی میری حیرانگی کا احساس ہوگیا۔ اس نے بتایا کہ اصل قصہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ ایک سخت حادثہ پیش آگیا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھے ہیں۔ وہ اپنا نیا مکان بنا رہے تھے۔ دیواریں کھڑی ہوگئیں تو حسب قاعدہ ان کے اوپر سانچہ بنا کر چھت ڈلوائی مگر ایک ماہ بعد جب سانچہ کھولا گیا تو ساری چھت دھڑام سے گر پڑی۔ اس حادثہ کا ان کے دماغ پر اتنا اثر ہوا کہ وہ نیم پاگل ہوگئے۔ اب وہ نہ کوئی کام کرتے ہیں۔ نہ کھانا کھاتے ہیں اور نہ بولتے ہیں۔ بس بت کی طرح اِدھر اُدھر پڑے رہتے ہیں جیسا کہ اس وقت آپ ان کو دیکھ رہے ہیں۔ مزید تحقیق کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ یہاں کچھ لوگوں نے یہ کاروبار کیا ہے کہ سمنٹ کے رنگ کی مٹی (پنڈول) کو باریک پیس کر بوریوں میں بھر دیتے ہیں۔ یہ مٹی دیکھنے میں بالکل سمنٹ جیسی ہوتی ہے۔ اس لئے لوگ اس کو سمنٹ سمجھ کر خرید لیتے ہیں۔ مذکورہ بزرگ کو بھی اتفاق سے اسی قسم کی سمنٹ مل گئی۔ اور اسی سمنٹ سے انھوں نے اپنی چھت بنوا دی۔ ظاہر ہے کہ ایسی سمنٹ سے بنی ہوئی چھت کا وہی انجام ہونا تھا جو ہوا۔

اسی طرح کوئی دولت کو اپنی چھت بنائے ہوئے ہے۔ کسی کو اپنے الفاظ پر بھروسہ ہے۔ کوئی سمجھتا ہے کہ اس کے ساتھیوں کی مدد اس کے لئے کافی ہے۔ کوئی بڑوں کا سہارا پکڑے ہوئے ہے۔ مگر یہ سب جھوٹے سہارے ہیں۔ قیامت جب ظاہری سانچہ کو ہٹائے گی تو اچانک لوگوں کی چھت ان کے اوپر اس طرح گر پڑے گی کہ وہاں کوئی تنکا بھی نہ ہوگا جو آدمی کا سہارا بن سکے۔

خدا کا فیضان

ہمارے گھر میں پہلے ایک میٹر بینڈ کا معمولی ٹرانسسٹر تھا۔ وہ صرف دہلی ریڈیو اسٹیشن پکڑتا تھا۔ ہم اس سے دہلی کی خبریں سن لیتے تھے۔ مگر دوسرے ملکوں کی نشریات سننا اس کے ذریعہ ممکن نہ تھا۔ کئی سال تک یہی چھوٹا ٹرانسسٹر ہمارے لئے ریڈیائی نشریات سننے کا ذریعہ بنا رہا۔

اس کے بعد ہم نے چار میٹر بینڈ کا بڑا ریڈیو سٹ خریدا۔ یہ ریڈیو سٹ دنیا بھر کے تمام ملکوں کے ریڈیو اسٹیشن کو پکڑتا تھا۔ اس کے ذریعہ جب ہم نے بی بی سی اور دوسرے بیرونی اسٹیشنوں کو سنا تو معلوم ہوا کہ ہم کتنی بڑی دولت سے محروم تھے۔ ہر روز مختلف ممالک نہایت قیمتی پروگرام نشر کرتے ہیں۔ ان کو سننے سے زبردست فکری اور معلوماتی فائدے ہوتے ہیں۔ مگر اس علمی خزانہ سے مستفید ہونا ہمارے لئے اس وقت تک ممکن نہ ہو سکا جب کہ ہم نے بڑا ریڈیو سٹ اپنے لئے حاصل نہ کیا۔

خدا اور بندے کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ خدا کا فیضان گویا ایک لامحدود نشر گاہ ہے۔ اس سے ہر لمحہ رزق رب کا مینھ برستا رہتا ہے۔ مگر آپ اس سے کتنا پائیں، اس کا انحصار آپ کے اپنے "ریڈیو سٹ" پر ہے۔ اگر آپ کا ریڈیو سٹ چھوٹا ہے تو آپ بہت کم چیزیں اخذ کر سکیں گے۔ اور اگر آپ کا ریڈیو سٹ بڑا ہے تو آپ کے اوپر اتنا زیادہ خدا کا فیضان برسے گا گویا کہ آپ خدائی فیضان کے اتھاہ سمندر میں نہا اٹھے ہیں۔

آجکل ہر آدمی محدودیت کا شکار ہے۔ کوئی شخص ہے جو کسی گروہی خول میں بند ہے۔ کوئی اپنے آپ کو حقیر مفادات میں اس طرح گم کئے ہوئے ہے کہ اس کو آگے پیچھے کی کوئی خبر نہیں۔ کسی کی سطحیت اس کو گہری حقیقتوں کا ادراک کرنے میں مانع بنی ہوئی ہے کسی کی تنگ نظری نے اس کو اس قابل نہیں رکھا ہے کہ وہ وسیع تر دائرہ کی معرفت حاصل کر سکے۔

بند کوٹھری میں سورج کی روشنی نہیں پہنچتی۔ اسی طرح بند ذہن خدا کا فیضان پانے سے محروم رہتا ہے۔ خدا کا فیضان اسی کو ملتا ہے جو اپنے ذہن کے دروازے کھولنے پر راضی ہو جائے۔

خدا کی نشانی

ان فی السماوات والارض لأیات للمومنین وفی خلقکم وما یبث من دابۃ أیات لقوم یوقنون۔ واختلاف اللیل والنہار وما انزل اللہ من السماء من رزق فاحیا بہ الارض بعد موتہا وتصریف الریاح أیات لقوم یعقلون (الجاثیہ ۳-۵)

بے شک آسمانوں اور زمین میں ایمان والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ اور تمہارے اور حیوانات کو پیدا کرنے میں جن کو زمین میں پھیلا دیا ہے نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لئے۔ اور رات اور دن کے آنے جانے میں اور اس رزق میں جس کو اللہ نے اتارا ہے پھر اس سے زمین کو زندہ کیا اس کے خشک ہونے کے بعد اور ہواؤں کے چلنے میں نشانیاں ہیں عقل والوں کے لئے۔

قرآن میں کثرت سے اس طرح کی آیتیں ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ کائنات میں سوچنے والے لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے انسان سے جن معنوی حقیقتوں پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے ان کی مادی تمثیلات اس نے کائنات میں ہر طرف قائم کر دی ہیں۔ تاکہ آدمی کے لئے ان حقیقتوں کو سمجھنا آسان ہو جائے۔ تاکہ وہ دکھائی دینے والی چیزوں کے آئینہ میں نہ دکھائی دینے والی چیزوں کو دیکھ سکے۔

سورج اور چاند خدا کی روشن ہستی کا تعارف ہیں۔ چڑیاں اور جانور خدا کی خدائی کے معصوم نمائندے ہیں۔ آسمان خدا کی عظمت و قدرت کا اعلان ہے۔ پانی اور ہوا خدا کی رحمت و شفقت کا ایک نمونہ ہیں۔ درخت اور پہاڑ خدا کے لامحدود حسن کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

انسان اگر دنیا میں اس طرح رہے کہ اس کے دماغ کی کھڑکیاں کھلی ہوئی ہوں۔ وہ دیکھنے والی چیزوں کو دیکھ رہا ہو تو ساری دنیا اس کو خدا کی یاد دلانے والی بن جائے گی۔ وہ ہر چیز میں خدا کا نور پائے گا۔ ہر چیز میں وہ خدا کی حکمت کو دریافت کرے گا۔ کائنات اس کے لئے ایک خدائی سمندر بن جائے گی جس میں وہ نہائے۔ زمین و آسمان اس کے لئے خدائی جلوہ گاہ بن جائیں گے جہاں وہ اپنے رب سے ملاقات کرے۔

ارتقاء کا فریب

نظریہ ارتقاء کا دعویٰ ہے کہ انسان اور حیوان دونوں ایک ہی نسل سے ہیں۔ انسان دوسرے حیوانات ہی کی ترقی یافتہ نوع ہے نہ کہ کوئی علیحدہ نوع۔ اس دعویٰ کے سلسلے میں جو سوالات پیدا ہوتے ہیں ان میں سے ایک اہم سوال یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ ہے تو بیچ کی وہ انواع کہاں ہیں جو مفروضہ ارتقائی عمل کے مطابق ابھی موجودہ انسان کے مقام تک نہیں پہنچی تھیں۔ وہ ابھی حیوان اور انسان کے درمیان تدریجی ارتقاء کے مراحل طے کر رہی تھیں۔

اس نظریہ کے حامیوں کے پاس اس کے جواب میں قیاس و گمان کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ چارلس ڈارون نے اپنی کتاب میں بار بار ہم بخوبی قیاس کر سکتے ہیں (We may well suppose) کا جملہ استعمال کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یقیناً ایسا ہوا ہے، اگرچہ ابھی ہمیں اس کے تمام نمونے حاصل نہیں ہو سکے ہیں۔ اس فرضی یقین کی بنیاد پر ایک پورا شجرۂ نسب تیار کر لیا گیا ہے جو انسان کی نسل کو بندر کی نسل تک جا ملاتا ہے۔ بندر اور انسان کے درمیان کی یہ کڑیاں تمام کی تمام مفروضہ کڑیاں ہیں مگر بالکل غلط طور پر ان کو گم شدہ کڑیاں (Missing links) کہا جاتا ہے۔

ان خیالی قسم کی گم شدہ کڑیوں کی تلاش پچھلے ایک سو سال سے جاری ہے۔ بار بار دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ فلاں گم شدہ کڑی ہاتھ آگئی ہے۔ انھیں میں سے ایک کڑی وہ ہے جس کو پلٹ ڈاؤن مین (Piltdown Man) کہا جاتا ہے۔

پلٹ ڈاؤن مین کو تقریباً آدھی صدی تک "عظیم دریافت کہا جاتا رہا۔ یہ سمجھا جاتا رہا کہ یہ ماقبل تاریخ کا وہ انسان ہے جو ایک طرف انسانی اوصاف کا حامل تھا اور دوسری طرف وہ بندر (چمپینزی) کی بھی کچھ خصوصیات اپنے اندر رکھتا تھا۔ تاریخ کی کتابوں میں باقاعدہ اس کے حوالے شامل ہو گئے۔ وہ کالجوں کے نصاب میں پڑھایا جانے لگا۔ مثال کے طور پر آر ایس لل (R.S. Lull) کی مشہور کتاب عضویاتی ارتقاء (Organic Evolution) سات سو صفحات پر مشتمل ہے اور ٹکسٹ بک کی حیثیت سے رائج ہے۔ اس میں انسان اور حیوان کے درمیان جن معلوم کڑیوں" کا ذکر کیا گیا ہے وہ حسب ذیل چار ہیں:

1. Ape-man of Jawa
2. Piltdown man

3. Neanderthal Man
4. Cro-magnon Man

مگر بعد کی تحقیقات سے ثابت ہوا کہ پلٹ ڈاؤن مین ایک مکمل فریب تھا۔ اس سلسلہ میں سائنس دانوں کے تحقیقی نتائج مختلف کتابوں اور مقالات میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کو جاننے کے لئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کا مقالہ یا "پلٹ ڈاؤن فورجری" نامی کتاب کا مطالعہ کافی ہے۔ جس کو آکسفرڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کیا ہے۔ چند کتابوں کے نام یہ ہیں :

1. *Bulletin of the British Museum* (Natural History) Vol. 2, No. 3 and 6
2. J.S. Weiner, *The Piltdown Forgery* (1955)
3. Ronald Millar, *The Piltdown Men* (1972)
4. *Readers Digest*, November 1956
5. *Popular Science* (Monthly) 1956

چارلس ڈاسن (Charles Dawson) نامی ایک انگریز متحجر ہڈیوں (Fossil Bones) کے جمع کرنے کا بہت شائق تھا۔ ۱۹۱۲ء کا واقعہ ہے کہ وہ کچھ ہڈیوں کو لے کر برٹش میوزیم پہنچا اور یہ خبر دی کہ یہ ٹکڑے اسے جنوبی انگلینڈ کے ایک مقام پلٹ ڈاؤن (Piltdown) میں ایک کھوہ کے اندر کنکریوں کے درمیان پڑے ہوئے ملے ہیں۔ برٹش میوزیم کے ایک نامور عالم ڈاکٹر آرتھر اسمتھ وڈورڈ (A.S. Woodward) نے اس میں خصوصی دلچسپی لی اور بتائے ہوئے مقام پر پہنچ کر کھدائی کے ذریعہ مزید ٹکڑے حاصل کئے۔ اس طرح بیس سے کچھ زیادہ ہڈیوں اور دانت کے ٹکڑے جمع کر کے ان کا مطالعہ شروع کیا گیا۔

ان حاصل شدہ ٹکڑوں میں سب سے زیادہ نمایاں ایک جبڑے کا ٹوٹا ہوا حصہ تھا جو واضح طور پر ایک بندر کا جبڑا معلوم ہوتا تھا۔ مگر اس میں ایک خاص چیز بندر سے مختلف تھی۔ یہ اس میں لگے ہوئے داڑھ کے دو دانت تھے جن کی اوپری سطح ہموار (Flat) تھی۔ جو کہ صرف کسی انسانی دانت ہی میں ہو سکتی ہے۔ چنانچہ قیاس کر لیا گیا کہ یہ جبڑا کسی قدیم انسان کا ہے۔ اور اس کے بعد نہایت آسانی سے اس کو ارتقا کی ایک گم شدہ کڑی قرار دے دیا گیا۔ تلاش کرنے والوں نے جلد ہی پلٹ ڈاؤن کے آس پاس وہ کھوپڑی بھی حاصل کر لی جو دور سابق کے اس انسان کے سر پر قدرت نے پیدا کی تھی!
مذکورہ بالا کھوہ میں ماقبل تاریخ کے زمانے کے کچھ جانوروں کے آثار ملے جن سے یہ متعین ہو گیا کہ "پلٹ ڈاؤن مین" قدیم بر فانی دور کا انسان ہے جو پانچ لاکھ سال پہلے زمین کے اوپر گزر چکا ہے۔

اس تحقیق نے دوسری معلوم کی ہوئی گم شدہ کڑیوں کے مقابلہ میں اس کو قدیم ترین معلوم انسان کی حیثیت دے دی۔ چارلس ڈاسن عظیم اعزازات کا مستحق قرار دیا گیا کیوں کہ اس نے سائنس کی ایک پیچیدہ گتھی کو حل کرنے میں مدد دی تھی۔

پتھر میں تبدیل شدہ یہ انسانی ہڈیاں جو حاصل ہوئی تھیں وہ پورے انسانی ڈھانچہ کے صرف بعض اجزاء تھے۔ مگر ماہرین نے ان کی روشنی میں قوت تخیل سے کام لے کر پانچ لاکھ سال پہلے کے انسان کا ایک پورا ڈھانچہ تیار کر لیا جو اپنی بے ڈھنگی پیشانی اور بندر نما جبڑوں کے ساتھ چالیس سال تک سائنس دانوں کا مرکز توجہ بنا رہا۔ مگر ۱۹۵۰ء میں یکایک پلٹ ڈاؤن مین کی حیثیت کو سخت دھکا لگا۔ جب طبقات الارض کے ایک عالم ڈاکٹر کنتھ آکلے (Kenneth Oakley) نے ایک کیمیاوی طریقے کو استعمال کر کے اس کی تاریخ معلوم کی۔

یہ ایک اصول ہے کہ کوئی ہڈی جتنے دنوں تک زمین میں دفن پڑی رہے گی وہ اسی کے بقدر زیادہ مقدار میں ایک مخصوص عنصر کو جذب کرتی ہے جس کا نام فلورین (Fluorine) ہے۔ ڈاکٹر آکلے کی آزمائش سے معلوم ہوا کہ حاصل شدہ ہڈیوں میں جتنی فلورین پائی جاتی ہے۔ اس کے لحاظ سے اس کی عمر صرف پچاس ہزار سال ہونی چاہئے نہ کہ پانچ لاکھ سال۔

بعد کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ پلٹ ڈاؤن مین کی کھوپڑی کے متعلق آکلے کا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ مگر اسی کی بنیاد پر اس نے جبڑے کی عمر بھی جو اسی قدر فرض کر لی تھی وہ صحیح نہیں تھی۔ جبڑا درحقیقت موجودہ زمانے کے ایک بندر کا تھا جو فرضی طور پر مذکورہ کھوپڑی کے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا۔

آکلے کی مذکورہ دریافت نے پلٹ ڈاؤن کو دوبارہ ایک معما بنا دیا کیوں کہ پانچ لاکھ سال پہلے کے ایک ڈھانچے کو تو گم شدہ کڑی فرض کیا جا سکتا تھا مگر ایک ایسا جاندار جو صرف پچاس ہزار سال پہلے موجود رہا ہو اس کا گم شدہ کڑی ہونا بالکل ناقابل قیاس تھا۔

اس کے بعد ۱۹۵۳ء کی ایک شام کو لندن کی ایک دعوت میں آکلے کی ملاقات آکسفرڈ یونیورسٹی میں انسانیات کے ایک پروفیسر ڈاکٹر وینر (J.S. Weiner) سے ہوئی۔ ڈاکٹر وینر آکلے کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ اس کے بعد گھر آ کر اس نے سوچنا شروع کیا کہ آخر اس کی حقیقت کیا ہے، سب سے زیادہ حیرانی اس کو پلٹ ڈاؤن مین کے دانت کے بارے میں تھی۔ "ایک بندر نما جبڑے میں انسانی دانت جو اس طرح ہموار ہیں جیسے کسی نے ریتی سے ...." یہ سوچتے ہوئے اچانک ایک نیا خیال اس کے ذہن میں آیا " ایسا تو نہیں ہے کہ کسی نے ریتی سے گھس کر ان دانتوں کو

چکنا کر دیا ہو۔" اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ حقیقت کے قریب پہنچ گیا ہے۔ اب وہ اپنے سامنے تحقیق کا ایک نیا میدان پا رہا تھا۔

وینر نے اپنے ایک ساتھی سر ولفرڈ لی گروز کلارک (Sir Wilfred Le Gros Clark) کی معیت میں چمپینزی (بندر کی ایک قسم) کا ایک داڑھ کا دانت لیا، اس کو ریت کر ہموار کیا اور اس کے بعد اسے رنگ کر دیکھا تو وہ پلٹ ڈاؤن کے دانت سے بالکل مشابہ تھا۔ اس کے بعد وہ دونوں برٹش میوزیم گئے تاکہ پلٹ ڈاون مین کے جبڑے حاصل کر کے اس کے متعلق اپنے قیاس کی تحقیق کریں۔ لوہے کا ایک مقفل بکس جو خاص طور پر فائر پروف بنایا گیا تھا، اس کے دروازے کھلے اور اس کے اندر سے پلٹ ڈاون کے ڈھانچے کے مقدس ٹکڑے نکالے گئے تاکہ سائنسی طریقوں کے مطابق ان کا گہرا تجزیہ کیا جائے۔ اکسرے مشین اور دوسرے جدید قسم کے آلات حرکت میں آ گئے۔ ایک مخصوص قسم کا کیمیاوی طریقہ بھی استعمال کیا گیا جو نائٹروجن کی کمی کو معلوم کر کے یہ بتاتا ہے کہ اس پر کتنا وقت گزر چکا ہے۔

وینر کا قیاس صحیح تھا۔ ان مشاہدات سے معلوم ہوا کہ پلٹ ڈاون مین کے جبڑے کی ہڈی کوئی پرانی ہڈی نہیں تھی بلکہ عام قسم کے ایک بندر سے حاصل کی گئی تھی۔ ہڈی کا قدرتی رنگ چونکہ متحجر ہونے کے بعد بدل جاتا ہے، اس لئے فریب دہندہ نے نہایت ہوشیاری سے اس کو مہوگنی رنگ میں رنگ دیا تھا۔ رنگ کو عین مطابق بنانے کے لئے چند مخصوص اجزا استعمال کئے گئے تھے۔ گہرے مطالعہ کے بعد معلوم ہوا کہ دانت کی سطح پر ایسے خراش موجود ہیں جو بلا اشتباہ اس بات کی خبر دے رہے ہیں کہ دانت مصنوعی طور پر رگڑا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے کناروں میں غیر فطری قسم کی تیزی بھی تھی جو کہ صرف ریتی سے رگڑنے ہی کی صورت میں ہو سکتی ہے۔

۱۹۵۳ء میں مندرجہ بالا تینوں محققین (آکلے، وینر، کلارک) نے اعلان کیا کہ جبڑا اور دانت بالکل فرضی ہیں — اس کے بعد وینر نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اتنا بڑا فریب جو گھڑا گیا اس کا مصنف کون تھا۔ اس نے تمام ممکن تفصیلات جمع کرنا شروع کیں، ملک بھر کے سفر کئے تاکہ پلٹ ڈاؤن کے واقعہ سے متعلق جو افراد ہیں ان سے گفتگو کرے، جو لوگ مر چکے تھے وہ ان کے عزیزوں اور دوستوں سے ملا۔ اخبار کے قدیم فائلوں سے اس سلسلے کی تمام رپورٹیں پڑھ ڈالیں۔

اس گہرے مطالعہ کے بعد پلٹ ڈاؤن کے واقعہ سے تمام افراد بالکل بری نظر آئے۔ مگر ایک شخص (چارلس ڈاسن) اس سے مستثنیٰ تھا۔ جو اس واقعہ کا ہیرو تھا۔ تمام معلومات اشارہ

کر رہی تھیں کہ اس بے بنیاد بات کا اصل مصنف ڈاسن ہی ہے۔

چارلس ڈاسن ایک کامیاب قانون داں تھا۔ وہ انگلینڈ کے اس مخصوص خطے کا باشندہ تھا جہاں متحجرات (Fossils) کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ڈاسن کو متحجرات سے بہت دل چسپی پیدا ہوگئی اس کا یہی مشغلہ بن گیا کہ وہ متحجر ہڈیاں جمع کیا کرتا تھا۔ پلٹ ڈاؤن مین کے واقعہ سے پہلے وہ دور قدیم کے متعدد جانوروں کے ڈھانچے حاصل کرکے لندن کے عجائب خانے میں بھیج چکا تھا۔

بعد کو ڈاسن کو وہ مذاق سوجھا جس نے ۴۰ سال سے زیادہ مدت تک اہل علم کو فریب میں مبتلا رکھا۔ ڈاسن کے ایک ملاقاتی نے بتایا کہ ایک مرتبہ وہ آواز دئے بغیر ڈاسن کے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے دیکھا کہ ڈاسن کچھ تجربات میں مشغول ہے۔ وہ مختلف برتنوں میں کھاری اجزاء اور رنگین عرق ڈال کر ہڈیوں کو اس میں ڈبوئے ہوئے تھا۔ ڈاسن نے اس کو دیکھ کر گھبرائے ہوئے انداز میں وضاحت کی کہ وہ متحجر ہڈیوں کو رنگ رہا تھا۔ تاکہ یہ معلوم کرے کہ قدرتی طور پر ان کا جو رنگ ہے وہ کیسے بنا ہے۔ اس قسم کے اور واقعات معلوم ہوئے جنھوں نے اس خیال کی تصدیق کردی کہ اس گھڑے ہوئے فریب کا مصنف ڈاسن ہے۔ مگر یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب کہ اس سے بہت پہلے ڈاسن ۱۹۱۶ء میں ۵۲ برس کی عمر میں عین اپنی شہرت کے وقت مر چکا تھا۔

ڈاسن نے اپنے جھوٹ کو مکمل کرنے کے لئے ایک اور تدبیر کی۔ اس نے پتھر کے کچھ اوزار پیش کئے اور بتایا کہ یہ اسے پلٹ ڈاؤن کے مقام پر ملے ہیں۔ چنانچہ یہ تسلیم کرلیا گیا کہ یہ پتھر کے وہ اوزار ہیں جن سے پانچ لاکھ سال پہلے کا ناقص انسان کام لیا کرتا تھا۔ مگر بعد کی تحقیقات نے ان کو بھی بالکل جعل ثابت کردیا۔ ڈاسن نے اسی قسم کا ایک پتھر کا اوزار ہیری موریز (Harry Moris) کو دیا تھا۔ موریز ایک بنک کلرک تھا اور پتھر کے پرانے نمونے جمع کرنے کا شائق تھا۔ بعد کو موریز اپنی تحقیق سے اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ پتھر کا اوزار بالکل جعلی ہے۔ موریز نے اس پتھر کو اپنی مخصوص الماری میں دوسرے نمونوں کے ساتھ رکھ چھوڑا تھا۔ جب وینر کو اس کی اطلاع ملی تو اس کا شوق بڑھا مگر اس سے بہت پہلے موریز کا انتقال ہوچکا تھا۔

وہ پتھر کہاں ہے؟ وینر کو یہ سوال پریشان کرنے لگا۔ موریز کے مرنے کے بعد اس کی الماری دو ہاتھوں میں منتقل ہوچکی تھی۔ تاہم وینر نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ الماری کھولنے پر معلوم ہوا کہ اس کے اندر بارہ خانے ہیں جن میں بہت سے نمونے لیبل لگے ہوئے رکھے ہیں۔ آخری خانے میں پلٹ ڈاؤن کا پتھر کا اوزار تھا اس پر موریز کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے یہ الفاظ درج تھے:۔

"Stained by C. Dawson with intent to defraud"

یعنی اس کو ڈاسن نے بالکل جعلی طور پر خود اپنے ہاتھ سے رنگا تھا تاکہ دنیا کو دھوکا دے کہ یہ بہت پرانے زمانے کا اوزار ہے۔ ایک نوٹ میں موریز نے یہ بھی بتایا تھا کہ ہائیڈرو کلورک ایسڈ پتھر کے بھورے رنگ کو ختم کر کے اس کو معمولی سفید رنگ کے پتھر میں تبدیل کر دیتا ہے۔

تبصرہ

یہ واقعہ بتارہا ہے کہ دور قدیم کی ہڈیوں کے ٹکڑے جمع کر کے ان کی بنیاد پر جو قیاسی ڈھانچے کھڑے کئے گئے ہیں ان کی حقیقت کیا ہے۔ بے شک دور قدیم میں کوئی ڈاسن موجود نہیں تھا جو ہم کو دھوکا دینے کے لئے ان ہڈیوں کا حلیہ بگاڑ دیتا۔ مگر لاکھوں اور کروروں برس تک آندھی، طوفان اور زلزلے زمین کے اوپر جو الٹ پلٹ کر رہے تھے ان کی وجہ سے ہڈیوں کے مقام اور ان کی ہیئت میں وہ ساری تبدیلیاں ہو نا ممکن ہیں جن کا آج ہم نے "ڈاسن مین" کی صورت میں تجربہ کیا ہے۔ پھر ارتقار کے حامیوں کے پاس وہ کون سا علم یقین ہے جس کی بنیاد پر وہ نامعلوم ماضی کے بارے میں اتنی قطعیت کے ساتھ اپنا دعویٰ پیش کر رہے ہیں۔

اس موضوع پر اپنے مضمون کو ختم کرتے ہوئے ماہنامہ پاپولر سائنس (Popular Science) کا مضمون نگار آخر میں لکھتا ہے،

پلٹ ڈاؤن کی خیالی داستان اب ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکی ہے۔ مگر ایک معما ابھی تک حل نہ ہوسکا۔ وہ کیا مقصد تھا جس کے لئے ڈاسن نے اتنا بڑا جھوٹ تیار کیا؟ اس کو اس کام سے کوئی مالی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ برٹش میوزیم کو اس نے جو ہڈیاں فراہم کی تھیں وہ اس نے محض تحفہ کے طور پر پیش کی تھیں۔ اس نے ان کی کوئی قیمت وصول نہیں کی۔ پھر کیا شہرت اس کا مقصد تھا۔ کیا اس زبردست فریب کے ذریعہ وہ محض ایک نداق کرنا چاہتا تھا۔ اس انگریز جعل ساز کو آخر کس چیز نے اس کام پر آمادہ کیا۔ اس کا معلوم کرنا کیمیاوی اور طبیعی تجربوں کی دسترس سے باہر ہے۔ اور شاید وہ ہمیشہ ایک راز ہی رہے گا۔"

یہ فقرہ درحقیقت اس بات کا اعتراف ہے کہ تجربی علم (Tested Knowledge) اپنی محدودیتوں کی وجہ سے کائنات کی توجیہہ نہیں کرسکتا۔ وہ ہماری دنیا کے صرف بعض واقعات کا تجربہ کرسکتا ہے، جب کہ ہمیں ایک ایسے علم کی ضرورت ہے جو تمام واقعات کا تجربہ کرے۔ جو تمام حقیقتوں کو ہم پر آشکارا کرسکے۔ ایسا کامل علم صرف وحی کا علم ہے، اس کے سوا کوئی اور علم اس ضرورت کو پورا نہیں کرسکتا۔

علم کا صدقہ

قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم: افضل الصداقۃ ان یتعلّم المرءُ المسلمُ علماً ثم یعلّمہ اخاہ المسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سب سے اچھا صدقہ یہ ہے کہ مسلمان ایک علم سیکھے پھر اس کو اپنے مسلمان بھائی کو سکھائے۔

(رواہ احمد عن ابی ہریرہ)

صدقہ کیا ہے۔ صدقہ دراصل اس خیر خواہی کا نام ہے جو ایک بھائی کی طرف سے اپنے دوسرے بھائی کے لئے ظاہر ہوتی ہے۔ اس خیر خواہی کا اظہار کبھی مال کی صورت میں ہوتا ہے. کبھی ایک اچھی نصیحت کی صورت میں اور کبھی کسی دوسری صورت میں۔ خیر خواہی انسان کے سینہ میں جاری ہونے والا ربانی چشمہ ہے اور صدقۂ علم اس ربانی چشمہ کی خارجی سیرابی۔

علم (سچائی کی معرفت) بلاشبہ اس کائنات کی سب سے بڑی چیز ہے اور یہی وجہ ہے کہ علم سب سے بڑا صدقہ ہے۔ آسمان کے نیچے ظاہر ہونے والے تمام واقعات میں یہ سب سے زیادہ انوکھا واقعہ ہے کہ ایک آدمی کسی دوسرے شخص کی بھلائی کے لئے تڑپے اور اس کو سچائی کا وہ نور پہنچائے جو اس کو خدا کی طرف سے ملا ہے۔

دوسرے کو علم دینا اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ آدمی دوسرے کا خواہ بن جائے۔ اس کے لئے آدمی کو دوسرے کا درد اپنے سینہ میں محسوس کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے کو پانے والا بنانے کے لئے اپنے آپ کو نہ پانے پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ اپنی بات کو دوسرے کی نظر میں قابل قبول بنانے کے لئے اپنے آپ کو دوسرے کے مقام پر کھڑا کرنا پڑتا ہے۔ اپنے اور دوسرے کے درمیان سننے اور سنانے کی فضا بنانے کی خاطر یک طرفہ طور پر ان تمام جھگڑوں کو ختم کر دینا پڑتا ہے جو دونوں کے درمیان معتدل فضا کو برہم کئے ہوتے ہوں۔

علم کا صدقہ سب سے بڑی قربانی کی قیمت پر دیا جاتا ہے۔ یہ دینا اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ آدمی اپنے آپ کو خالی دیکھنے پر راضی ہو جائے۔ اس دنیا میں دینے والا بننے کے لئے کھونے والا بننا پڑتا ہے۔ چوں کہ لوگ کھونے والا بننے کے لئے تیار نہیں ہوتے اس لئے وہ دینے والے بھی نہیں بنتے۔

دوسرا قرآن

ایک مسلمان نے اپنے ایک غیر مسلم دوست کو قرآن کا ترجمہ پڑھنے کے لئے دیا۔ غیر مسلم نے بڑے شوق اور احترام کے ساتھ قرآن کو لیا اور اس کو شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا۔ اگلی ملاقات میں اس نے قرآن کا مذکورہ نسخہ واپس کرتے ہوئے کہا:

"اب دوسرا قرآن دیجئے"

مسلمان نے سمجھا کہ وہ قرآن کا دوسرا نسخہ مانگ رہے ہیں۔ چنانچہ وہ دوسرا نسخہ لائے اور اس کو مذکورہ غیر مسلم کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ غیر مسلم نے اس کو لے کر کچھ دیر الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر کہا "یہ تو وہی قرآن ہے۔ میرا مطلب یہ تھا کہ اب وہ قرآن دیجئے جس پر آپ لوگ عمل کرتے ہیں"۔

غیر مسلم نے قرآن میں جو اسلام پڑھا وہ اس سے مختلف تھا جو اس نے مسلمانوں کی اپنی زندگی میں دیکھا تھا۔ غیر مسلم نے سمجھا کہ مسلمانوں کے یہاں شاید دو قرآن ہے۔ ایک وہ جس کو اس نے ابھی پڑھا ہے، دوسرا وہ جو ابھی اس کو پڑھنے کو نہیں ملا۔

بظاہر یہ ایک لطیفہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر امر واقعہ یہی ہے کہ مسلمانوں کا دو قرآن ہے۔ ایک وہ جو خدا کی طرف سے چودہ سو سال پہلے اترا تھا۔ دوسرا وہ جو انھوں نے خود لکھ رکھا ہے۔ اس دوسرے قرآن کا نام قرآن نہیں۔ اس کا نام قرآن کی تشریح وتعبیر ہے۔ مسلمانوں نے اپنی تشریح وتعبیر سے قرآن کے متوازی ایک اور قرآن لکھ رکھا ہے۔ اس دوسرے قرآن میں وہ سب کچھ ہے جس پر آج وہ عمل کر رہے ہیں۔

قرآن میں اسلام اطاعت کا نام ہے مگر مسلمانوں کی اپنی تشریح میں اسلام فخر کی چیز بن گیا ہے۔ قرآن کے مطابق نجات کا دارو مدار عمل پر ہے مگر مسلمانوں کی تشریح کے مطابق نجات کے لئے یہ کافی ہے کہ آدمی اپنے کو مسلمان کہتا ہو۔ قرآن کا اسلام یہ ہے کہ آدمی اپنا احتساب کرے مگر مسلمانوں کی تشریح کے خانہ میں اسلام اس کا نام ہو گیا ہے کہ آدمی احتساب عالم کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہو۔ قرآن کا اسلام سارے عالم کا اسلام ہے۔ مگر مسلمانوں کے ذہنی خانہ میں وہ ایک قومی چیز بن کر رہ گیا ہے۔

اعلیٰ ظرفی

امیر معاویہ کی خلافت کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ اس زمانہ میں روم کی مشرقی سلطنت کے اکثر حصے فتح ہو چکے تھے۔ رومی بادشاہ پسپا ہو کر قسطنطنیہ (ترکی) کے قلعہ میں رہنے لگا تھا۔ تاہم سرحد پر وہ مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا تھا۔ اسی قسم کی ایک جھڑپ میں ایک بار رومیوں نے کچھ مسلمانوں کو قید کر لیا جن میں قریش کا ایک آدمی بھی شامل تھا۔ رومی بادشاہ کو معلوم ہوا تو اس نے کہا کہ وہ لوگ میرے سامنے حاضر کئے جائیں۔

مسلمان قیدی اس حال میں دربار میں لائے گئے کہ ان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ رومی بادشاہ نے ان سے ذلت آمیز گفتگو کی۔ اس نے کہا کہ تم جیسے لوگوں کی سزا یہی ہے۔ ہم تم کو اسی طرح سزا دیں گے یہاں تک کہ تم مرجاؤ اور تمہارے ہم قوموں کو عبرت ہو کہ وہ ہمارے علاقہ کی طرف دیکھنا چھوڑ دیں۔

قریشی کو بادشاہ کا کلام سن کر غیرت آگئی۔ اس نے بادشاہ کو سخت انداز میں جواب دیا۔ اس نے کہا کہ جب تک تمہاری اسلام دشمنی باقی ہے تمہارے خلاف ہماری جنگ جاری رہے گی۔ اور تم جان لو کہ خدا کے راستہ میں ہمارا خون بہت سستا ہے مگر وہ اس وقت بہت قیمتی ہو جائے گا جب کہ تمہارے جیسا بادشاہ ہم کو قتل کرے۔

قریشی کا یہ جواب سن کر دربار کے ایک بطریق (Patriarch) کو غصہ آگیا۔ وہ اٹھ کر قریشی کے پاس آیا اور اس کے چہرہ پر دائیں بائیں دو طمانچہ مارا۔ قریشی کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اس لئے اس وقت وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ اپنی اس بے عزتی پر وہ چیخ پڑا:

وصاح القرشی باعلیٰ صوتہ - یا معاویۃ این انت لتنتقم من ھؤلاء الانذال الذین لطموا شریفا من اھلک - والتفت الی البطریق وقال، اقسم باللہ ان لی معک یوما ستعرف فیہ من انا۔

قریشی بلند آواز سے چیخا۔ اے معاویہ تم کہاں ہو کہ ان ذلیل لوگوں سے انتقام لو جنھوں نے تمہارے ایک شریف آدمی کو طمانچہ مارا ہے۔ پھر وہ بطریق کی طرف مخاطب ہوا اور کہا کہ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہارے ساتھ میرا ایک دن آئے گا،

جب کہ تم جان لوگے کہ میں کون ہوں۔

اس واقعہ کی خبر قسطنطنیہ سے دمشق پہنچی۔ امیر معاویہ کو اسے سن کر بہت رنج ہوا۔ انھوں نے عزم کیا کہ اس سلسلہ میں ضرور کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے۔ امیر معاویہ نے اولاً رومی بادشاہ سے تبادلہ کی بنیاد پر مسلمان قیدیوں کی رہائی کی بات کی۔ یہاں تک کہ مسلم قیدیوں کی تعداد کے مقابلہ میں رومی قیدیوں کی زیادہ تعداد کو واپس کرکے اپنے قیدیوں کو رہا کرالیا۔

اس کے بعد امیر معاویہ نے نہایت خاموشی کے ساتھ ایک منصوبہ بنایا۔ انھوں نے تلاش کرکے صور (شام) کے ایک آدمی کو حاصل کیا۔ وہ تاجر تھا اور رومی زبان جانتا تھا۔ امیر معاویہ نے کثیر مقدار میں اس کو سونے کے دینار دئے۔ اس کو پورا منصوبہ بتایا اور کہا کہ تم جاؤ اور کسی نہ کسی طرح اس بطریق کو پکڑ کر دمشق لے آؤ۔

اس آدمی نے تاجر کے روپ میں سفر کیا اور اس طرح دمشق سے قسطنطنیہ پہنچا۔ بطریق کے بارہ میں معلومات حاصل کرکے اس سے تعلقات پیدا کئے۔ اس کو قیمتی تحفے (عطر، جواہرات، ریشمی کپڑے وغیرہ) پیش کئے۔ اس طرح وہ کئی بار دمشق سے قسطنطنیہ اور قسطنطنیہ سے دمشق آتا جاتا رہا اور بطریق کو تحفے دیتا رہا۔ یہ پورا معاملہ اتنی رازداری کے ساتھ ہوا کہ تاجر اور امیر معاویہ کے سوا کسی اور کو اس کی مطلق خبر نہ ہوسکی۔

اس طرح لمبا عرصہ گزر گیا۔ جب بطریق سے کافی تعلقات ہوگئے تو اس نے بطور خود کچھ خاص تحفے لانے کی فرمائش کی۔ تاجر اس سے وعدہ کرکے واپس ہوا۔ وہ دمشق آیا۔ یہاں اس نے نہایت تیز رفتار اونٹنی حاصل کی۔ اونٹنی کو ایک آدمی کے ساتھ لاکر ایک خاص مقام پر ٹھہرایا۔ اس کے بعد وہ بطریق کے پاس گیا اور کہا کہ میں تمہارے تمام تحفے لے کر آیا ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو۔ اس طرح حیلہ کرکے وہ بطریق کو مذکورہ مقام پر لے گیا۔ یہاں دونوں نے اچانک بطریق کو پکڑ لیا۔ انھوں نے نہایت تیزی سے بطریق کے ہاتھ پاؤں باندھے اور اس کو سواری پر بٹھا کر ہوا کی رفتار سے دمشق کی طرف روانہ ہوگئے۔

بطریق جب دمشق پہنچ گیا تو امیر معاویہ نے ایک مجلس میں بہت سے لوگوں کو جمع کیا اور مذکورہ قریشی کو بھی بلالیا۔ اس کے بعد ایک پردہ ہٹایا گیا تو اس کے پیچھے مذکورہ بطریق موجود تھا۔ قریشی اس

کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ تاریخ کے اگلے الفاظ یہ ہیں :

قال معاویة یخاطب القرشی یا ابن عمی ، الان تستطیع ان تشکر الصوری فقد نفذ کل تدبیر دبرته له دون ان یخیب ظنی فی اقل شئ۔ والان تستطیع ان تاخذ بحقك من البطریق دون ظلم له۔

قال القرشی لولا انی اقسمت لعفوت عنه ، ورفع یده ولطمه لطمة واحدة وهو یقول هذه تکفی ، واعفو عنه فیما بقی۔

ونظر معاویة الی البطریق ، وقال : بعد هذا انت فی ضیافتنا ثلاثة ایام

ومرت الایام الثلاثة فاعادة الصوری ومعه کل الهدایا التی کان قد طلبها

وفی قصر ملك الروم التف البطارقة حول الملك یقول لهم لا تسیئوا الی اسری المسلمین منذ الآن فما رأیت مثلهم عزة وکرامة واخلاقا۔ ولو اراد معاویة ان یخطفنی لما عجز لکنه لا یرضی۔

امیر معاویہ نے قریشی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اے میرے چچا کے بیٹے ، اب تم اس صوری تاجر کا شکریہ ادا کرو۔ اس کو میں نے جو تدبیر بھی بتائی اس کو اس نے بغیر کسی ادنیٰ کمی کے نافذ کیا۔ اور اب تم اس بطریق سے اس پر ظلم کئے بغیر اپنا حق لے سکتے ہو۔ قریشی نے کہا کہ اگر میں نے قسم نہ کھائی ہوتی تو میں اس کو معاف کر دیتا۔ پھر ہاتھ اٹھایا اور اس کو ایک طمانچہ مارا اور کہا کہ بس یہ کافی ہے۔ بقیہ کو میں اس سے معاف کرتا ہوں۔ پھر معاویہ نے بطریق کی طرف دیکھا اور کہا کہ اب تم تین دن کے لئے ہمارے مہمان ہو۔ تین دن گزرنے کے بعد اس کو صوری تاجر نے اس حال میں واپس کیا کہ اس کے ساتھ وہ تمام تحفے تھے جن کو اس نے طلب کیا تھا۔ اس کے بعد قسطنطنیہ میں تمام بطریق رومی بادشاہ کے پاس جمع ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ اب مسلم قیدیوں کے ساتھ برا سلوک نہ کرو۔ کیوں کہ میں نے عزت اور شرافت اور اخلاق میں ان کے جیسا نہیں دیکھا۔ اور اگر معاویہ مجھ کو پکڑنا چاہتے تو وہ اس کے لئے عاجز نہ تھے مگر انھوں نے ایسا کرنا پسند نہیں کیا۔

الدعوة (مکة) ۱۴ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۵ھ

بادشاہ بھی

يروى ان عبد الملك بن مروان خطب يوماً خطبة بليغة ثم قطعها وبكى بكاءً شديداً ثم قال: يا ربّ ان ذنوبي عظيمة وان قليل عفوك اعظم منها۔ اللهم فامح بقليل عفوك عظيم ذنوبي۔ فبلغ ذالك الحسن فبكى وقال لوكان كلام يكتب بالذهب لكتب هذا الكلام

(الدعوة ۲ جمادی الآخرۃ ۱۴۰۵ھ)

بیان کیا جاتا ہے کہ عبد الملک بن مروان نے ایک روز ایک بلیغ خطبہ دیا۔ پھر وہ رک گیا۔ اور شدت کے ساتھ رویا۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ اے میرے رب، بے شک میرا گناہ بہت زیادہ ہے مگر تیری تھوڑی معافی اس سے بھی زیادہ ہے۔ اے اللہ، اپنی تھوڑی سی معافی سے میرے زیادہ گناہ کو مٹا دے۔ یہ بات حضرت حسن بصری کو پہنچی تو اس کو سن کر وہ رو پڑے اور کہا کہ اگر کوئی کلام سونے سے لکھا جاتا تو یقیناً یہ کلام اس قابل تھا کہ اسے سونے سے لکھا جائے۔

عبد الملک بن مروان (۸۵ - ۲۳ھ) بنو امیہ کا نہایت ذہین اور مدبر خلیفہ تھا۔ حجاج بن یوسف ثقفی اسی کا عامل تھا جس نے مکہ پر چڑھائی کی اور عبد اللہ بن زبیر کو قتل کیا۔ عبد الملک بن مروان کا شمار تابعین کے گروہ میں ہوتا ہے۔

مذکورہ واقعہ بتاتا ہے کہ قدیم زمانہ کے جابر بادشاہ بھی خدا کے خوف سے خالی نہ تھے۔ کسی نہ کسی موثر پر ان کا جذبہ پھٹ پڑتا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں بے حسی کا یہ عالم ہے کہ "دیندار" لوگ بھی خوف خدا سے خالی ہو گئے ہیں۔ ان کی نمازوں نے ان کے دلوں کو نرم نہیں کیا۔ ان کے ذکر نے ان کے سینہ کو چھلنی نہیں کیا۔ ان کا ایمان وہ ایمان نہیں بنا جو ان کو خدا کے سامنے کھڑا کر دے۔

موجودہ زمانہ کے لوگوں پر قرآن کے یہ الفاظ صادق آتے ہیں: پھر تمہارے دل سخت ہو گئے تو وہ پتھر کی مانند ہیں یا اس سے بھی زیادہ سخت۔ اور بعض پتھر تو ایسے ہیں جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں جو پھٹ پڑتے ہیں پھر ان سے پانی نکل آتا ہے۔ اور بعض ایسے ہیں جو خدا کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو (البقرہ ۷۴)

دیکھنے والا دیکھ رہا ہے

یہ واقعہ نئی دہلی میں ۱۱ فروری ۱۹۸۵ کو پیش آیا۔
کناٹ پلیس کے ہوٹل تاج میں ایک تقریب تھی۔ یہ تقریب دہلی کے ایک تاجر مسٹر ایس پی سونی نے اپنے لڑکے کی شادی کے سلسلہ میں نہایت اہتمام کے ساتھ منعقد کی تھی۔ شرکار کی تعداد تقریباً چار سو تھی جو سب کے سب اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔

لوگ تقریب کی رونقوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ اچانک ایک خاتون نے محسوس کیا کہ اس کا پرس چوری ہوگیا ہے۔ یہ مسز سنتوش سونی کا پرس تھا۔ اس میں پچاس ہزار روپئے نقد رکھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ اس کے اندر ایک قیمتی ہار بھی تھا جو خالص موتیوں کا بنا ہوا تھا۔

چوری کے واقعہ کو نہ پرس کی مالکہ نے دیکھا اور نہ دوسرے شرکار اس کو محسوس کرسکے۔ بظاہر یہ مکمل طور پر ایک راز تھا۔ چوری کرنے والا چوری کر چکا تھا۔ اور جس کی چوری ہوئی تھی اس کے لئے صرف یہ باقی رہ گیا تھا کہ وہ اپنی خوشیوں کو غم میں تبدیل کرکے اپنے گھر واپس چلی جائے۔ حتیٰ کہ ہوٹل کے ذمہ دار یہ ماننے کے لئے بھی تیار نہ تھے کہ چوری کا واقعہ ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ بناوٹی بات ہے۔ ہمارے یہاں ایسا نہیں ہوسکتا۔ ہوٹل والوں کی نظر میں یہ قصہ اتنا بے بنیاد تھا کہ انھوں نے اس کی ضرورت بھی نہیں سمجھی کہ ہال کا دروازہ بند کرکے لوگوں کی تلاشی لیں۔

اتنے میں بعض افراد کو خیال آیا کہ شادی کی تقریب شروع سے آخر تک (Video film) پر ریکارڈ کی گئی ہے، کیوں نہ اس کا معائنہ کیا جائے۔

فوراً تقریب کے شرکار اور ہوٹل کے ذمہ داروں کے سامنے ویڈیو ٹیپ چلایا گیا۔ اس سے پہلے تمام شرکار کی نگاہیں زرق برق اسٹیج پر لگی ہوئی تھیں جہاں دولہا اور دلھن رونق افروز تھے۔ مگر اب ان کی توجہ کا مرکز دوسرا تھا۔ جس منظر کو اس سے پہلے انھوں نے صرف تفریح کی نظر سے دیکھا، اب اس کو انھوں نے تفتیش کی نظر سے دیکھنا شروع کردیا۔

بہت جلد لوگوں کی نگاہیں ایک عورت پر جم گئیں جو ایک لڑکے کے ساتھ آیا کے روپ میں ہال کے اندر داخل ہوئی تھی۔ ابتداءً لوگوں نے یہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا کہ وہ معزز

مہمانوں میں سے کسی مہمان کے ساتھ آئی ہے۔ مگر اب اس کو ایک امکانی مجرم کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔

یہ عورت جو آپا کے روپ میں آئی تھی وہ اس سے بالکل بے خبر تھی کہ یہاں ویڈیو کیمرہ نصب ہے اور اس کی نظریں ہر لمحہ اس کو دیکھ رہی ہیں۔ وہ اس کی ہر حرکت کا نہایت باریکی کے ساتھ ریکارڈ کر رہی ہیں۔ وہ مشتبہ انداز میں ادھر سے ادھر جا رہی تھی۔

آخر کار لوگوں نے دیکھا کہ اس "آپا" نے شال میں چھپا ہوا اپنا ہاتھ باہر نکالا اور نہایت تیزی سے مذکورہ پرس کو اٹھا کر عین اس وقت اس کو اپنے کپڑوں کے اندر چھپا لیا جب کہ پرس کی مالکہ فوٹو کھنچوانے کے پروگرام میں کھوئی ہوئی تھی۔

جو واقعہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھا اس کو ویڈیو کیمرہ کی نگاہ نے بتا دیا جو مجموعی طور پر سارے منظر کی تصویر کشی کر رہا تھا۔ فوراً پولیس بلائی گئی اور پولیس کے سامنے دوبارہ پوری فلم چلائی گئی۔ جرم ثابت ہو گیا تھا۔ مذکورہ عورت کو پولیس نے تلاش کر کے گرفتار کر لیا۔ اس کا نام اخبار میں شیلا بتایا گیا ہے جو سلطان پوری کی رہنے والی ہے۔ ہندستان ٹائمس (۱۶ مارچ ۱۹۸۵) نے یہ کہانی تفصیل کے ساتھ شائع کرتے ہوئے یہ معنی خیز جملہ لکھا ہے:

You can not only spot the thief
but see her commit the cirme.

آپ نہ صرف چور کو پکڑ سکتے ہیں بلکہ اس کو جرم کرتے ہوئے دیکھ بھی سکتے ہیں۔

یہ دنیوی واقعہ آخرت کے واقعہ کا آئینہ ہے۔ یہ واقعہ تمثیل کے انداز میں بتا رہا ہے کہ کوئی بالاتر دیکھنے والا ہے جو ہر ایک کو دیکھ رہا ہے۔ وہ ان باتوں کو نہایت باریکی کے ساتھ ریکارڈ کر رہا ہے جس کی خبر نہ قریب کے لوگوں کو ہوتی اور نہ دور کے لوگوں کو۔ وہ ان باتوں کو بھی جانتا ہے جن کو لوگ نہیں جانتے۔ وہ ان چیزوں کو بھی دیکھتا ہے جن کو لوگ نہیں دیکھتے۔

دنیا کے واقعات آخرت کی حقیقتوں کا آئینہ ہیں۔ آج جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں ان واقعات کو دیکھا جا سکتا ہے جو کل کے دن پیش آنے والے ہیں۔ مگر اس مشاہدہ کے لئے بصیرت کی نگاہ درکار ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جو آنکھ والوں کے پاس بھی اکثر نہیں ہوتی۔

تباہی کی طرف

دوسری جنگ عظیم میں ۵ کروڑ افراد ہلاک ہوئے تھے اور ۹ کروڑ آدمی ہمیشہ کے لئے معذور ہوگئے۔ اس جنگ میں تقریباً چار ہزار ارب ڈالر کی جائداد تباہ ہوئی۔ اس سے پہلے جنگ عظیم اول میں تقریباً ایک کروڑ افراد ہلاک ہوئے تھے اور دو کروڑ افراد اپاہج ہوگئے تھے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد اس قسم کی کوئی عالمی جنگ نہیں ہوئی مگر چھوٹی چھوٹی جنگیں مسلسل جاری رہی ہیں۔ ۱۹۸۲ تک ۳۵ سالوں کے اندر دنیا بھر میں جو چھوٹی چھوٹی جنگیں ہوئیں ان میں مجموعی طور پر ایک کروڑ افراد ہلاک ہوگئے اور تقریباً پانچ سو ارب ڈالر کی جائداد تباہ ہوئی۔ اس مدت میں ۱۵۰ لڑائیاں ہوئیں۔ یہ معلومات ماسکو کے ایک ہفتہ وار نیو ٹائمز نے شائع کی ہیں۔

موجودہ زمانہ میں دولت کا سب سے بڑا مصرف جنگ (یا دفاع) کی تیاری ہے۔ ورلڈ بینک کے صدر مسٹر کلاسین (A.W. Clausen) نے کہا کہ ۱۹۸۵ میں صرف ایک سال کے اندر دولتمند ممالک ہتھیاروں کی فراہمی پر جو رقم خرچ کریں گے اس کی مقدار ایک ہزار بلین ڈالر ہے (ٹائمس آف انڈیا ، ۷ دسمبر ۱۹۸۴)

امریکہ کے سابق صدر جمی کارٹر نے ۱۵ جنوری ۱۹۸۱ کو امریکی ٹیلی وژن پر اپنی الوداعی تقریر کی تھی۔ انھوں نے قوم کو ایٹمی جنگ کے خطرہ سے آگاہ کیا جس کا ہونا ان کے خیال میں یقینی ہے۔ خواہ وہ دیر میں ہو یا جلد۔ اگر ایٹمی جنگ ہوئی تو آغاز جنگ کے ابتدائی چند گھنٹوں میں اتنے زیادہ آدمی ہلاک ہو چکے ہوں گے جتنا ساری تاریخ کی تمام جنگوں میں مجموعی طور پر ہلاک ہوئے ہیں۔ یہ بتاتے ہوئے انھوں نے کہا:

> Nuclear conflict would cause as much damage as a world war II every second. Survivers, if any, in despair amidst the poisoned ruins of a civilisation that had committed suicide.

ایٹمی جنگ ہر سکنڈ میں دوسری جنگ عظیم کے بقدر نقصان پہنچائے گی۔ اگر کچھ لوگ مرنے سے بچ جائیں گے تو وہ تہذیب کے زہریلے کھنڈر میں مایوسانہ پڑے ہوئے ہوں گے جو خودکشی کر چکی ہوگی (۱۶ جنوری ۱۹۸۱)

گواہی کا قانون

اسلام کے قانون شہادت میں دو عورت کی گواہی ایک مرد کے برابر مانی گئی ہے۔ قرآن میں قرض کے معاملہ کا قاعدہ بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ــــــ اپنے مردوں میں سے دو مرد کو گواہ بنالو۔ اور اگر دو مرد گواہ نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بنائی جائیں، ایسے گواہوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو۔ تاکہ ان دونوں عورتوں میں سے ایک اگر بھول جائے تو دوسری عورت اس کو یاد دلا دے (البقرہ ۲۸۲)

حالیہ تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ قرآن کا یہ قانون بالکل فطری ہے۔ کیونکہ وہ حیاتیاتی حقیقت کے عین مطابق ہے۔

ٹائمس آف انڈیا (۱۸ جنوری ۱۹۸۵) میں یو پی آئی کے حوالے سے ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ یہ رپورٹ اخبار کے صفحہ ۹ پر ہے اور اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

> MEMORISING ABILITY: Men have a greater ability to memorise and process mathematical information than women but females are better with words, a Soviet scientist says, reports UPI. 'Men dominate mathematical subjects due to the peculiarities of their memory', Dr. Vladimir Konovalov told the Tass news agency. "The stronger sex shows greater difficulties in processing and adapting language material."

عورتوں کے مقابلہ میں مردوں کے اندر اس بات کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ریاضیاتی معلومات کو یاد رکھیں اور اس کو ترکیب دے سکیں۔ مگر عورتیں الفاظ میں زیادہ بہتر ہوتی ہیں۔ یہ بات ایک روسی سائنس داں نے کہی۔ ڈاکٹر ولادیمیر کونولوف نے تاس نیوز ایجنسی کو بتایا کہ مرد ریاضیاتی موضوعات پر چھائے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ ان کے اندر حافظہ کی خصوصی صلاحیت ہے۔ صنف قوی لسانی مواد کو ترکیب دینے اور استعمال کرنے میں زیادہ مشکل محسوس کرتا ہے۔

مذکورہ آیت کا تعلق قرض سے ہے۔ یعنی وہ صورت جب کہ آج معاملہ کیا جائے اور آئندہ اس کی ادائگی ہو۔ ایسے معاملہ میں حکم دیا گیا کہ اس کے اوپر دو مرد گواہ ہوں۔ یا ایک مرد اور دو عورتیں گواہ مقرر کی جائیں۔ یہ بالکل واضح ہے کہ اس طرح کے معاملہ میں انصاف پسندی کے بعد دوسری چیز جو دیکھنے کی ہے وہ یادداشت ہے۔ اور جب حیاتیاتی طور پر عورت کی یادداشت مرد سے کم ہو تو یہ عین مطابق حقیقت ہے کہ ایک مرد کی جگہ دو عورتیں گواہ بنائی جائیں۔

ایک تقریر

دوستو ، میری بوڑھی آنکھیں جن کے لئے وقت آگیا تھا کہ وہ قبر میں دفن ہوں ، ان کے لئے خدا نے یہ مقدر کیا کہ وہ اس اجتماع کو دیکھیں۔ بخدا اگر آسمان سے آواز آئے کہ زمین پر ایک شخص ایسا ہے جس کو جلسہ اور اجتماع سے کوئی دلچسپی نہیں تو میں سمجھوں گا کہ یقیناً وہ میں ہی ہوں۔ اگر زمین پر کوئی ایک شخص ایسا ہو جس کی یہ تمنا ہو کہ وہ نہ کچھ بولے اور نہ کچھ لکھے بلکہ فطرت کی تنہائیوں میں گم ہو جائے تو مجھے یقین ہے کہ وہ میں ہی ہوں گا۔ مجھے اس میں ذرا بھی شبہہ نہیں کہ میری ان باتوں کو زمین و آسمان سن رہے ہیں اور قیامت میں وہ گواہی دیں گے کہ خدایا تیرے ایک عاجز بندے نے جو کچھ کہا تھا بالکل سچ کہا تھا۔

بخدا جس چیز نے میری تنہائیوں کو توڑا ، جس چیز نے مجھے مجبور کیا کہ میں اپنے خون کو سیاہی کروں اور اپنی بے زبانی کو زبان بناؤں وہ صرف یہ احساس تھا کہ جو اصل بات ہے وہی ان کہی پڑی ہوئی ہے۔ خدا کے نام پر ہنگامے جاری ہیں مگر کوئی خدا کے گیت گانے والا نہیں۔ چڑیاں خدا کے نغمے گارہی ہیں مگر انسان خدا کے نام پر دوسروں کی کبریائی کا چرچا کرنے میں مشغول ہے۔ سورج خدا کی روشنی بکھیرتا ہے مگر انسان کے پاس اپنے جھوٹے چراغوں کا بازار لگانے کے سوا اور کچھ نہیں۔ دین کے نام پر بے شمار سرگرمیاں نظر آتی ہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے دین اس کو سمجھا ہے کہ لفظی طلسمات کی نمائش کریں اور اس پر خدا کا بورڈ لگادیں۔ اپنی ذات کا جھنڈا بلند کریں اور اس پر اعلاءِ کلمۃ اللہ کا طغرا لکھ دیں۔ اپنے دنیوی مفادات کی تجارت کریں اور اس کو آخرت کا عنوان دے دیں۔

بخدا میری کمزور زبان اس قابل نہیں کہ وہ بولے ، میری بوڑھی ہڈیوں میں یہ طاقت نہیں کہ وہ لکھے۔ میرے کمزور قدموں میں اتنی جان نہیں کہ وہ چل کر کسی کے پاس پہنچے۔ مگر جس آدمی کا دل غم سے پھٹ رہا ہو وہ اپاہج ہو کر بھی گھسٹتا ہے۔ وہ بے زبان ہو کر بھی چیخنے کی کوشش کرتا ہے۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ میں اس زمین کا وہ کمزور ترین انسان ہوں جس کو اس کے دل کے کرب نے مجبور کر دیا ہے کہ وہ چلے اور اس کے غم کے بوجھ نے اس کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ بولے۔

میرے دوستو، آپ ایک لمبا جغرافی سفر طے کر کے یہاں آئے ہیں۔ اس کے لئے ہم یقیناً آپ کے شکر گزار ہیں۔ مگر ابھی آپ کو ایک فاصلہ اور طے کرنا ہے۔ یہ روحانی فاصلہ ہے جب تک آپ اس دوسرے فاصلہ کو طے نہ کریں ہمارا آپ کا یہاں آنا صرف انسانی ڈھانچوں کا آنا رہے گا، وہ روحوں کا آنا نہیں بن سکتا۔

دوستو، جو کچھ مجھے کہنا ہے اس کو سننے کے لئے کان نہیں بلکہ دل درکار ہیں۔ جو کچھ مجھے بولنا ہے اس کو سمجھنے کے لئے زبان دانی نہیں بلکہ حقیقت شناسی مطلوب ہے۔ جو باتیں میں آپ تک پہنچانا چاہتا ہوں اس کو آپ تک پہنچنے کے لئے صرف یہ کافی نہیں کہ میرے اور آپ کے درمیان ہوا کی لہریں ہوں جو میرے منھ سے نکلے ہوئے الفاظ کو آپ تک منتقل کر دیں۔ یہ بات تو اتنی نازک اور اتنی لطیف ہے کہ وہ صرف ان دیکھے روحانی تاروں ہی پر منتقل ہوتی ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ان لوگوں میں سے بنائے جو کان کے بجائے دل سے سنتے ہیں۔ جو لغت اور زبان کے بجائے حقائق کی روشنی میں باتوں کو سوچتے ہیں۔

بجلی کا بلب ہر شخص اپنے کمرہ میں لٹکا سکتا ہے مگر اسی شخص کا بلب روشن ہوتا ہے جس نے اپنے بلب اور پاور ہاؤس کے درمیان ربط قائم کر رکھا ہو، جس نے اپنے بلب کو پاور ہاؤس سے جوڑ لیا ہو۔ یہی معاملہ حقیقتوں کے دل نشین ہونے کا بھی ہے۔ ان باتوں کو وہی لوگ سمجھیں گے جو انسانوں کی عظمت کے بجائے خدا کی عظمت میں جیتے ہوں۔ جو دنیا کے بجائے آخرت کو اپنا مرکز توجہ بنائے ہوئے ہوں۔ جو دکھائی دینے والی حقیقتوں سے زیادہ ان حقیقتوں کو اہمیت دیں جو موجودہ آنکھوں سے کسی کو دکھائی نہیں دیتیں۔

آئینہ کے سامنے آپ کوئی چیز رکھیں تو آئینہ میں عین وہی چیز دکھائی دے گی جو اس کے سامنے رکھی گئی ہے۔ مگر الفاظ کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ کوئی آدمی الفاظ ہی کے ذریعہ اپنی بات دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ مگر الفاظ کا ذریعہ بے حد ناقص ذریعہ ہے۔ آدمی کہتا کچھ ہے اور سمجھنے والا اس کو کچھ سمجھ لیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سننے والا کسی بات کو اپنے ذہن سے سنتا ہے نہ کہ سنانے والے کے ذہن سے۔

ہائی اسکول کے ایک طالب علم کا لطیفہ ہے۔ جس زمانہ میں اس کا امتحان تھا اسی زمانہ میں اس

کے شہر میں ایک فلم چل رہی تھی جس کا نام تھا دو بدن ۔ طالب علم نے اس فلم کو کئی بار دیکھا تھا۔ اس کے بعد اس کا امتحان ہوا۔ امتحان میں اس کے فارسی کے پرچہ میں ایک سوال تھا کہ دو یدن کا مطلب بتاؤ۔ طالب علم کے ذہن پر چونکہ دو بدن کا لفظ گھوم رہا تھا۔ اس نے دو یدن کو دو بدن پڑھ لیا اور دو بدن نامی فلم کے بارہ میں جو کچھ جانتا تھا وہ اس کے جواب میں لکھ ڈالا۔

یہی معاملہ دین کے بارہ میں بھی ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال لیجئے۔ ایک بزرگ نے پیغمبروں کے مشن کا یہ تصور قائم کیا کہ وہ حکومت پر قبضہ کرکے مکمل قانونی نظام قائم کریں ۔ اس ذہن کے تحت انھوں نے سورہ اعراف پڑھنی شروع کی ۔ یہاں تک کہ وہ اس مقام پر پہنچے جہاں موسیٰ اور فرعون کا مکالمہ درج ہوا ہے۔ ان کو نظر آیا کہ موسیٰ کے جواب میں فرعون مصر یہ جملہ کہہ رہا ہے۔ یرید ان یخرجکم من ارضکم (وہ چاہتا ہے کہ تم کو تمہاری زمین سے نکال دے) یہ جملہ لے کر مذکورہ بزرگ نے فوراً یہ تقریر شروع کر دی کہ موسیٰ کا مشن یہ تھا کہ فرعون کو مصر کے تخت سے ہٹا کر اس پر قبضہ کریں اور مصری زندگی کے تمام شعبوں میں خدا کے مکمل قانون کو نافذ کریں۔

یہ استدلال سراسر بے بنیاد تھا۔ کیونکہ موسیٰ کا مشن موسیٰ کے کلمہ سے معلوم ہوگا نہ کہ فرعون کے کلمہ سے۔ پھر آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی خصوصی مدد سے فرعون کو، اس کے لشکر کو اور اس کی تمام طاقت کو سمندر میں غرق کر دیا۔ اس کے بعد مصر میں موسیٰ کے لئے میدان بالکل صاف تھا۔ وہ نہایت آسانی سے مصر کے دارالسلطنت میں داخل ہو کر ملک کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے سکتے تھے۔ مگر حضرت موسیٰ نے ایسا نہیں کیا۔ اس کے برعکس وہ صحرائے سینا کے غیر آباد علاقہ میں چلے گئے ـــــ قرآن میں جو لفظ لکھا ہوا تھا وہ " دو یدن " تھا مگر پڑھنے والے نے اپنے ذہنی رجحان کی وجہ سے اس کو " دو بدن " پڑھ لیا۔

غالباً دس سال پہلے کی بات ہے۔ مجھے مالیگاؤں کے ایک مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں تقریر کے لئے بلایا گیا۔ کافی بڑا اور سجا ہوا پنڈال تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ شامیانہ کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں جب مائک کے سامنے آیا تو میری زبان سے نکلا: "میں تقریر نہیں کروں گا بلکہ بے تقریر پیش کروں گا" یہ سن کر منتظمین اور سامعین کے اندر عجیب بے چینی پیدا ہو گئی۔ وہ سمجھے کہ میں واقعتہً تقریر نہیں کروں گا بلکہ تقریر کئے بغیر بیٹھ جاؤں گا۔ یہ دیکھ کر میں نے دوبارہ

کہا کہ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں سرے سے تقریر نہیں کروں گا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ میں کہوں گا وہ عام معنوں میں کوئی تقریر نہیں بلکہ ایک بے تقریر ہوگی۔

آج بھی میں اپنے ذہن میں اسی قسم کی کیفیت محسوس کر رہا ہوں۔ میرے پاس جو کچھ کہنے کے لئے ہے وہ ایک "بے تقریر" ہے پھر کیسے ان لوگوں کو مطمئن کیا جائے جو اس چیز کو سننے کے لئے اجتماعات میں آتے ہیں جس کو تقریر کہا جاتا ہے۔ آہ، ایک ایسا اجتماع کیسے کیا جائے جو بے اجتماع ہوتا ہے۔ ایک ایسی بات کیسے کہی جائے جو کہنے میں نہیں آتی۔ حق یہ ہے کہ جہاں الفاظ ختم ہو جائیں وہاں سے معانی کا آغاز ہوتا ہے۔ جہاں زبان گنگ ہو جائے وہاں سے بات شروع ہوتی ہے۔ پھر کیسے وہ بات کہی جائے جو لفظوں میں نہیں سماتی۔ کیسے وہ حقیقت کھولی جائے جس کو کھولنے کی طاقت انسان کے پاس نہیں۔

میرے دوستو، یہ کوئی اجتماع اور تقریر کا معاملہ نہیں۔ یہ تو دل کے ساز پر ربانی نغمہ چھیڑنے کا معاملہ ہے۔ دنیا کا نغمہ مادی ساز کے تاروں پر چھڑتا ہے۔ ہر گیت کار دکان سے ایک ساز خرید کر اپنے راگ فضا میں بکھیر سکتا ہے اور لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ اس کو ہر کان میں داخل کر سکتا ہے۔ مگر آخرت کا نغمہ بازار سے خریدے ہوئے ساز پر نہیں چھڑتا۔ وہ تو دل کے ساز پر چھڑتا ہے۔ اور آدمی کا حال یہ ہے کہ ہر آدمی اپنے دل کے ساز کو اپنے سینہ کے اندر بند کئے ہوئے ہے۔ پھر وہ نغمہ کیسے چھیڑا جائے جو صرف دل کے چھپے ہوئے تاروں پر چھڑتا ہے۔ وہ ساز کیسے بجایا جائے جو معانی کی زبان میں بجتا ہے اور روح کے کانوں سے سنا جاتا ہے۔

افراد کی سطح پر ہر زمانہ میں کچھ اللہ والے ہوئے ہیں۔ مگر اجتماعی سطح پر حقیقی اسلامی انقلاب تاریخ میں صرف ایک ہی بار پیش آیا۔ نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ تاریخ میں ایک ہی بار یہ واقعہ ہوا کہ انسانوں کی ایک جماعت نے اپنے دل حق کے حوالے کر دئے۔ انھوں نے اپنے سینہ کا ڈھکن کھول دیا کہ اس کے تاروں کو چھیڑا جائے۔ تاکہ ان کی فطرت کے ساز پر حق کا نغمہ گایا جا سکے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارہ میں خدا نے کہا کہ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ ورنہ تاریخ کے ہر دور میں تو وہی کچھ پیش آتا رہا جس کی تصویر اس آیت میں کھینچی گئی ہے ـــــ یاحسرۃ علی العباد ما یاتیھم من رسول الا کانوا بہ یستھزؤن

ہمارے سامنے جو کام ہے وہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ یہ تاریخ کا سب سے زیادہ نازک اور سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ ہم ان روحوں کو رکروٹ کرنا چاہتے ہیں جو دنیا میں خدا کی عدالت بن سکیں۔ خدا چاہتا ہے کہ وہ دنیا میں اپنی ترازو کھڑی کرے۔ مگر خدا کا ترازو لوہے اور لکڑی سے نہیں بنتا۔ وہ زندہ روحوں اور تڑپتے ہوئے دلوں کے ذریعہ بنتا ہے۔ ہم کو وہ انسان درکار ہیں جن کے اوپر لوگوں کی سرکشی کو تولا جائے۔ جن کے آئینہ میں لوگوں کی جھوٹی دینداری کو بے نقاب کیا جائے۔ جن کی کسوٹی پر ظالم کا ظالم ہونا ثابت کیا جائے۔ ترازو اس وقت ترازو بنتا ہے جب کہ وہ اپنے پلہ پر من اور کوئنٹل کا بوجھ لادنے کو برداشت کرے۔ اسی طرح آپ بھی اس وقت خدا کے ترازو بن سکتے ہیں جب کہ آپ یک طرفہ طور پر دنیا کا بوجھ اٹھانے کے لئے تیار ہو جائیں یہ اپنے آپ کو حالات کے کولھو میں ڈال کر پس اٹھنا ہے۔ پھر کون ہے جو اپنے بیج کو دنیا کی مٹی میں دفن کرے تاکہ خدا اس کو آخرت میں ہرے بھرے درخت کی صورت میں اگائے۔

خدا کی ترازو بننے کا انعام بہت بڑا ہے۔ خدا آخرت میں فرشتوں کو اپنی ترازو بنائے گا مگر دنیا میں تو بہر حال انسان ہی اس کی ترازو بن سکتے ہیں۔ اس عمل کا اخروی انجام تو یقینی طور پر معلوم ہے اور وہ جنت ہے۔ مگر دنیا کا انجام معلوم نہیں۔ وہ حضرت یحییٰ اور حضرت مسیح جیسا بھی ہو سکتا ہے اور حضرت موسیٰ اور حضرت محمد جیسا بھی۔

دوستو، اسلام کی ایک نئی تاریخ بنانی ہے۔ یہ اجتماع اس لئے کیا گیا ہے کہ ہم یہ جانیں کہ آپ میں سے کون ہے جو اس مشکل کام میں ہمارا ساتھ دیتا ہے یہ مَن انصاری الی اللہ کی پکار ہے، اور اب یہ دیکھنا ہے کہ آپ میں سے کون ہے جو یہ کہنے کے لئے تیار ہو کہ نحن انصار اللہ

اسلام کی نئی تاریخ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی قلعہ پر اسلام کا جھنڈا لہرانے لگے یا کسی تخت پر مسلم بادشاہ بیٹھا ہوا دکھائی دے۔ اسلام کی نئی تاریخ کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی بگڑی ہوئی تصویر کو دوبارہ صاف کیا جائے اور اس کو اس کی صحیح صورت میں دنیا کے سامنے لایا جائے۔ دنیا کی دوسری قومیں ہمارے لئے مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں مگر ہم نے ان کو فریق بنا لیا ہے اسلام آخرت کی صراط مستقیم ہے مگر اس کو دنیوی اور قومی جھگڑوں کا عنوان بنا دیا گیا ہے۔ خدا کا دین اس لئے اترا کہ اس کو دوسری قوموں تک پہنچایا جائے مگر ہم نے خدا کے دین کو اپنی

قومی سیاست کا ضمیمہ بنالیا۔ اس صورت حال کو بدلنا ہے۔ اسلام کو آخرت کی صراط مستقیم کے طور پر دنیا کے سامنے لانا ہے۔ مسلمانوں اور دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کے رشتہ کو بحال کرنا ہے۔

آج جو صورت حال ہے اس نے اس کام کو وقت کا مشکل ترین کام بنا دیا ہے۔

۱۹۴۵ میں تاریخ میں پہلی بار یہ واقعہ ہوا کہ جاپان کے اوپر دو ایٹم بم گرایا گیا جس نے جاپان کی معاشیات کو بالکل برباد کر دیا۔ اس کے بعد جاپانی بادشاہ ہیروہٹو نے ریڈیو پر ایک تقریر کی۔ اس مختصر تقریر میں اس نے کہا :

> ہمیں ایک ناقابل برداشت کو برداشت کرنا ہے۔ تاکہ ہم جاپان کی اگلی نسلوں کی تعمیر نو کر سکیں۔

کسی بھی چیز کی نئی تاریخ ہمیشہ قربانی کی قیمت پر بنتی ہے۔

قرآن میں بہت سے مقامات پر یہ بات کہی گئی ہے کہ اے ایمان لانے والو، میری مدد کرو۔ جس کے بدلے میں تم کو میں بہت بڑا انعام دوں گا (یاایہا الذین اٰمنوا ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم، محمد ۷) من ذا الذی یقرض اللہ قرضاحسنا فیضٰعفہ لہ، حدید ۱۱) خدا تمام زمین و آسمان کا مالک ہے ہر قسم کی طاقتیں اسی کے پاس ہیں۔ وہ کسی کام کے لئے بھی کسی کا محتاج نہیں۔ اس کے باوجود یہ کہنا کہ میری مدد کرو، مجھے قرض دو، ظاہر کرتا ہے کہ خدا کی انتہاہ سلطنت میں کوئی گوشہ ایسا بھی ہے جہاں خدا کو اپنے بندوں کی مدد کی ضرورت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی بندے کی اس سے بڑی خوش قسمتی نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنے رب کے لئے استعمال ہو۔ اس کا وجود اپنے خدا کے کسی کام میں آجائے۔

یہ خدا کا کام کیا ہے جس کی ادائگی کے لئے اسے بندوں کی ضرورت ہے۔ یہ اعلان حق کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو ایک خاص منصوبہ کے تحت بنایا ہے۔ یہ منصوبہ امتحان کا منصوبہ ہے یعنی لوگوں کو پیدا کر کے انھیں آزاد ماحول میں رکھنا اور پھر دیکھنا کہ کون خدا کا تابعدار بن کر رہتا ہے اور کون اس کا سرکش بن جاتا ہے۔ اس کے بعد خدا دوسری کامل دنیا بنائے گا جہاں اپنے وفادار بندوں کو جنت میں داخل کرے گا اور سرکش لوگوں کو جہنم میں دھکیل دے گا۔ اس امتحانی

منصوبہ کا تقاضا تھا کہ پورے معاملہ کو غیب میں رکھا جائے۔ اگر خدا اور فرشتے اور جنت اور دوزخ سب سامنے ہوں تو پھر امتحان کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

خدا نے اپنے منصوبہ کو اشارات (آیات) کی زبان میں پوری کائنات میں پھیلا دیا ہے کائنات کی ہر چیز حد درجہ خدائی کنٹرول میں رہ کر بیتا رہی ہے کہ یہاں انسانوں کو بھی اسی طرح پابند زندگی گزارنا ہے جس طرح ساری کائنات پابند نظام پر چل رہی ہے۔ اسی کے ساتھ انسان کی فطرت میں خیر و شر کی تمیز رکھ دی گئی ہے۔ جو ہر وقت خاموش زبان میں اندر سے بولتی رہتی ہے کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

تاہم فطرت اور کائنات میں ہدایت کے اس انتظام کو خدا نے کافی نہیں سمجھا۔ کیوں کہ وہ انتہائی مکمل ہونے کے باوجود بہر حال خاموش زبان میں تھا۔ خدا نے چاہا کہ نطق کی زبان میں بھی انسان کو حقیقت واقعہ سے باخبر کر دیا جائے تاکہ فیصلہ کے دن کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ رہے کہ آپ ہم کو ایسے جرم کی سزا دے رہے ہیں جس سے ہمیں باخبر نہیں کیا گیا تھا۔ خدا کی طرف سے انسان کے اوپر آخری طور پر اتمام حجت ہو جائے (النساء ۱۶۵)

یہی وہ مقام ہے جہاں خدا کو انسان کی ضرورت ہے۔ خدا نے اپنے امتحانی منصوبہ کی وجہ سے ایسا کیا ہے کہ اپنی وسیع سلطنت کے ایک خاص گوشہ میں سارا اختیار رکھتے ہوئے اپنے کو بے اختیار کر لیا ہے۔ وہ زبان رکھتے ہوئے یہاں خاموش ہے۔ عیاں ہوتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو یہاں چھپا دیا ہے۔ ہر قسم کی قدرت رکھتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو بے قدرت کر لیا ہے۔

اب خدا کو کچھ انسان درکار ہیں جو لوگوں کے سامنے خدا کے نمائندے بن کر کھڑے ہوں۔ جو خدا کی زبان سے بولیں۔ جو چھپی ہوئی حقیقتوں کو اس طرح نمایاں کریں کہ وہ لوگوں کو کھلی ہوئی حقیقتوں کی طرح نظر آنے لگیں۔ وہ خدا کی جنت اور جہنم کو بے پردہ کر کے لوگوں کے سامنے رکھ دیں۔

یہ کام کوئی لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کرنے کا کام نہیں ہے۔ یہ خدائی مشن میں کامل درجہ کی شمولیت چاہتا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ آدمی اللہ کے کام کو اپنا کام بنالے۔ وہ زندگی اور مال کی ہر قیمت دینے کے لئے تیار ہو جائے۔ وہ اپنے آپ کو اتنا زیادہ اس میں شامل کرے کہ جو حقیقتیں کائناتی سطح پر غیب میں ہیں وہ اس کی ذات کی سطح پر شہود واقعہ بن جائیں۔

دہلی میں کچھ لوگ ہمارے یہاں آئے۔ انھوں نے الرسالہ کی بہت تعریف کی۔ میں نے پوچھا کہ الرسالہ کی کیا چیز آپ کو پسند آئی۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ میں سائنسی مضامین ہوتے ہیں اور ہم کو پسند ہے کہ اسلام کو سائنسی انداز میں پیش کیا جائے۔ کسی نے کہا کہ الرسالہ میں چھوٹے چھوٹے واقعات سے بڑے بڑے سبق نکالے جاتے ہیں۔ کسی نے کہا کہ الرسالہ میں اقتصادی تعمیر کو بہت موثر انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ باتیں الرسالہ میں ہوتی ہیں۔ مگر وہ ضمنی اور اضافی ہیں۔ یہی باتیں الرسالہ کا مشن نہیں ہیں۔ ہمارا مقصد اسلام کا سائنسی مشاعرہ کرنا نہیں ہے۔ اور نہ کسی قسم کے پر لطف ادب کا بازار لگانا ہے۔ الرسالہ کا مشن اس سے کہیں زیادہ آگے ہے۔

ایسے لوگوں کے متعلق میں کہوں گا کہ انھوں نے ابھی تک الرسالہ کو نہیں پڑھا۔ اگر انھوں نے اس کو پڑھا ہوتا تو وہ کہتے کہ الرسالہ میں قیامت کی کڑک ہوتی ہے۔ اس میں حشر و نشر کی ہولناکیاں ہوتی ہیں۔ اس میں جنت اور جہنم کے مناظر ہوتے ہیں۔ اس میں خدائے ذو الجلال کی تجلیاں ہوتی ہیں۔ الرسالہ کی اصل چیزیں یہی ہیں۔ اسی شخص نے الرسالہ کو پڑھا ہے جس نے الرسالہ کو اس حیثیت سے پایا ہے۔

جیسا کہ اعلان کیا گیا تھا، یہ اجتماع الرسالہ کے مشن سے اتفاق رکھنے والوں کا اجتماع ہے۔ جو لوگ الرسالہ کو گہرائی کے ساتھ پڑھتے رہے ہیں ان کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ اس اجتماع کا مقصد اور اس کی نوعیت کیا ہے۔ تاہم آغاز ہی میں صاف لفظوں میں میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ یہ اجتماع ہم نے اس لئے نہیں کیا ہے کہ ہم یہاں کوئی سائنسی مشاعرہ کریں یا ادبی اور تقریری کرتب کے نمونے آپ کے سامنے پیش کریں۔ اس قسم کی مصروفیت کو نہ ہم اپنے لئے جائز سمجھتے اور نہ آپ کے لئے۔ یہ اجتماع تو در حقیقت صرف اپنے جائزہ کے لئے کیا گیا ہے۔ اس کا اگر کوئی عنوان ہو سکتا ہے تو وہ حدیث کے الفاظ میں صرف یہ ہے کہ ـــــ حاسبوا انفسکم قبل ان تحاسبوا (اپنا حساب کر لو قبل اس کے کہ تمہارا حساب کیا جائے) عقل مند انسان وہ ہے جو خود ہی اپنا جائزہ لے لے۔ کیوں کہ جس کا جائزہ قیامت میں لیا جائے گا وہ ہلاک ہوا۔ فمن نوقش فقد هلك)

ایسے بے شمار لوگ ہیں جنھوں نے انگریزی اور فرانسیسی فوجوں کو دیکھا کہ وہ مسلم دنیا کو روند رہی ہیں تو ان کا خون کھول اٹھا اور وہ ان سے اور ان کے حامیوں سے لڑنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ مگر ہمیں ایسے انسانوں کی تلاش ہے جو شیطان کی فوج کو دیکھ کر تڑپ ہیں اور لوگوں کو جہنم میں جاتا ہوا دیکھ کر بے قرار ہوں۔ ایسے افراد سے زمین بھری ہوئی ہے جو مسلم قوم کے خلاف غیر قوموں کی کارروائیوں کو دیکھ کر بھڑک اٹھے ہوں۔ مگر ہم ان انسانوں کو ڈھونڈنے نکلے ہیں جو ہواؤں کو دیکھ کر تڑپ ہیں۔ جن کو درختوں کا منظر بے قرار کر دیتا ہو۔ جو زمین و آسمان کو دیکھ کر مبہوت ہو گئے ہوں۔ لوگ انسانی واقعات میں گم ہیں۔ ہم ان انسانوں کو تلاش کر رہے ہیں جو خدائی واقعات میں گم ہو سکیں۔ لوگوں کو دنیا کی محرومی کا احساس متحرک کئے ہوئے ہے۔ ہم کو وہ انسان درکار ہیں جن کو آخرت کی محرومی کے احساس نے دیوانہ بنا رکھا ہو۔

الرسالہ کی پکار من انصاری الی اللہ کی پکار ہے۔ مگر یاد رکھئے کہ یہ ایک قربانی کا راستہ ہے یہاں پانا نہیں کھونا ہے۔ یہ دنیا کو برباد کر کے آخرت کی تعمیر کرنا ہے۔ یہ اپنے بیج کو فنا کرنا ہے تاکہ اس کے اندر سے خدا کا شاداب درخت نکلے۔ یہ اپنے کو مٹی میں ملانا ہے تاکہ اس کے اندر سے خدا کا باغ اگے۔ یہ دنیا ایسی دنیا ہے جہاں ٹوٹے ہوئے دلوں کی آواز ہی خدا کے گیت میں ڈھلتی ہے۔ جنت ان لوگوں کا انتظار کر رہی ہے جو اِس خدائی کام کی طرف بڑھیں۔ جو اپنی بربادی کی قیمت پر خدا کے گھر کی تعمیر کریں۔ میرے دوستو، اس کام کی طرف آگے بڑھو، قبل اس کے کہ خدا کا فرشتہ قیامت کا بگل بجا دے اور کسی کے لئے نہ کچھ کرنے کا موقع باقی رہے اور نہ انعام خداوندی میں حصہ دار بننے کا۔

میرے دوستو، اللہ کو ایک باغ اگانا ہے، جنت کا باغ۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کو کچھ درخت درکار ہیں جو خدائی معیار پر پورے اتریں اور خدائی باغ میں لگائے جاسکیں۔ قرآن میں مومن کی مثال ہرے بھرے تناور درخت سے دی گئی ہے اور اس سلسلے میں فرمایا گیا ہے کہ اصلها ثابت وفرعها فی السماء (ابراهیم) دنیا میں اگنے والا درخت مومن کی زندگی کی مادی تمثیل ہے۔ عام درخت زمین سے نکلتا ہے اور آسمان کی طرف بلند ہو کر پھیلتا ہے۔ اسی طرح مومن جس ربانی درخت کا نام ہے وہ دنیا میں اگتا ہے اور اس کو آسمان میں لگایا جاتا ہے۔

اسلام کا معاملہ کوئی نسلی معاملہ نہیں اور نہ وہ چھو منتر کا معاملہ ہے۔ اسی طرح اسلام کا معاملہ سیاسی اکھیڑ پچھاڑ اور تقریروں اور تحریروں کا سیلاب بہانے کا نام بھی نہیں ہے۔ اسلام کا معاملہ یہ ہے کہ آدمی اپنے وجود کو بیج کی صورت میں اس دنیا میں دفن کرنے کے لئے تیار ہو۔ زمین میں دفن ہونے والا بیج ہی اگ کر درخت بنتا ہے۔ اسی طرح دفن ہونے والی روح ہی دوبارہ زندگی پا کر سرسبز و شاداب بنتی ہے۔

اسلام اپنے آپ کی اور خدا کی دریافت ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ دریافت کیسی عجیب اور کیسی لذیذ چیز ہے۔ ایک دریافت کو پاکر ارشمیدس ننگا حوض سے نکل کر بھاگا۔ اور ایک دریافت کو پاکر اصمعی بدو کا خیمہ سے نکل کر صحرا کی طرف دوڑ پڑا۔ اسلام اس بات کی دریافت ہے کہ میں کیا ہوں اور خدا کیا ہے۔ میں عاجز مطلق ہوں اور خدا قادر مطلق۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی دریافت کا نام اسلام ہے۔ ہم ایک ایسی دنیا میں ہیں جہاں سارا اختیار خدا کی طرف ہے اور ساری بے اختیاری ہماری طرف۔ مگر اس حقیقت واقعہ پر انسانی اختیار کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ ہماری زندگی کے واقعات بظاہر ہمارے کئے سے ہو رہے ہیں مگر وہ حقیقۃً خدا کے کرنے سے ہو رہے ہیں۔ اسی پردہ کو پھاڑنے کا نام ایمان ہے۔ جس کو اس قسم کا ایمان حاصل ہوتا ہے وہ اس کے بعد بالکل دوسرا انسان بن جاتا ہے۔

(۱۰ اپریل ۱۹۸۲)

پیغام

چودھویں صدی ہجری پر اسلام کا ایک دور ختم ہوا ہے ، پندرہویں صدی ہجری میں اسلام کے نئے دور کا آغاز ہونا ہے۔ مزید یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج وہ تمام موافق حالات مکمل طور پر پیدا ہو چکے ہیں جو اسلام کا نیا دور شروع کرنے کے لئے درکار ہیں۔

جب رات کا اندھیرا ختم ہوتا ہے اور نئے دن کا سورج نکلنے کے آثار ظاہر ہوتے ہیں تو یہ فطرت کی طرف سے اس بات کا خاموش اعلان ہوتا ہے کہ روز و شب کی ایک گردش پوری ہوگئی۔ اب اس کی دوسری گردش شروع ہونے والی ہے۔ جو شخص چاہے اس کی روشنی میں اپنا سفر شروع کرے اور منزل پر پہنچ جائے۔

صبح کے وقت سورج کا نکلنا ہر آدمی کو دو چیزوں کے درمیان کھڑا کر دیتا ہے۔ ایک وہ موقع جو گزر چکا۔ دوسرا وہ موقع جو سامنے کھلا ہوا موجود ہے۔ جو شخص بھی ان مواقع کو استعمال کرے گا وہ لازماً اپنی منزل پر پہنچ جائے گا۔ تاہم امتحان کی اس دنیا میں مواقع صرف انھیں کے لئے ہوتے ہیں جو مواقع کو استعمال کریں۔ جو لوگ مواقع کو استعمال کرنے میں ناکام رہیں ان کے لئے کوئی موقع موقع نہیں۔ کامیابی دوسرے لفظوں میں موجود مواقع کو استعمال کرنے ہی کا دوسرا نام ہے۔

کوئی شخص پچھلے کل میں اپنا سفر شروع نہیں کر سکتا۔ سفر جب بھی شروع ہوگا "آج" سے شروع ہوگا نہ کہ گزرے ہوئے "کل" سے۔ جو لوگ آج کے دن بھی کل میں جئیں ان کے لئے اس دنیا میں بربادی کے سوا اور کوئی چیز مقدر نہیں۔

جو مواقع گزر چکے انھیں بھول جائیے۔ جو مواقع آج موجود ہیں ان کو جانیے اور انھیں استعمال کیجئے۔ انشاء اللہ آپ یقیناً کامیاب ہوں گے۔ یاد رکھئے گزرا ہوا دن کبھی کسی کے لئے واپس نہیں آیا۔ گزرا ہوا دن آپ کے لئے بھی واپس آنے والا نہیں۔

روداد سفر

لاہور میں قرآن اکیڈمی (زیر صدارت ڈاکٹر اسرار احمد صاحب) کی طرف سے ہر سال بڑے پیمانہ پر قرآنی سیمنار ہوتا ہے۔ پچھلے چند سالوں میں مجھے اس کا دعوت نامہ ملا مگر بعض وجوہ سے میں سفر نہ کر سکا۔ اس سال پھر دعوت نامہ آیا تو میں نے طے کر لیا کہ اس بار انشاءاللہ اس میں شرکت کروں گا۔ اس کے مطابق مارچ ۱۹۸۵ کا آخری ہفتہ لاہور میں گزرا۔

پہلا سفر

پہلی بار میں ۱۹۴۵ میں لاہور گیا تھا اس وقت میری عمر تقریباً ۲۰ سال تھی۔ یہ میری زندگی کے اس دور کی بات ہے جب کہ میں "تلاش حق" کے کٹھن مرحلہ سے گزر رہا تھا۔ میں اپنے ماحول میں ایک سیدھے سادے نوجوان کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ میرے چچازاد بھائی مولانا اقبال احمد سہیل (۱۹۵۵ - ۱۸۸۷) مجھ کو "مرزا پھویا" کہتے تھے۔ یہ حالات تھے کہ ۱۹۴۳ میں میرے ساتھ ایک شدید حادثہ گزرا۔ یہ گویا ایک قسم کا انفجار (Explosion) تھا جس نے میری بند شخصیت کو کھول دیا۔

یہ حادثہ بظاہر ایک مادی ناکامی کا واقعہ تھا مگر عملاً وہ میرے لئے روحانی ناکامی کا واقعہ بن گیا۔ اس حادثہ نے میری سوئی ہوئی فطرت کو جگا دیا۔ اچانک میں نے جانا کہ میں نہیں جانتا۔ میں نے اپنے نہ جاننے کو دریافت کیا۔ اس حادثہ نے میری زندگی کو سکون کے دور سے نکال کر اضطراب کے دور میں داخل کر دیا۔

میری کشتی اگرچہ "سمندر" میں ٹوٹی تھی مگر شاید کسی نامعلوم قوت نے میرے اندر پیدا ہونے والے نفسیاتی ہیجان کو استعمال کر کے مجھے تلاش حق کے "جزیرہ" میں ڈال دیا۔ اس زمانہ میں میں نے فانی بدایونی (۱۹۴۰ - ۱۸۷۹) پر ایک مضمون لکھا تھا۔ یہ مضمون لکھنؤ کے رسالہ نگار میں چھپا تھا۔ اس کا عنوان تھا "فانی حقیقت کی تلاش میں سرگرداں" یہ مضمون فانی سے زیادہ خود مضمون نگار کی اپنی تصویر تھا۔ میں نے تلاش حق میں اپنی سرگردانی کو فانی کے آئینہ میں دیکھ لیا تھا۔

یہ دور تقریباً پانچ سال تک رہا۔ اس وقت میرے اوپر جو حالات گزرے وہ اتنے شدید تھے کہ کئی بار میں نے چاہا کہ میں خودکشی کرلوں۔ دیوانگی کے عالم میں کبھی میں کسی دور دراز بستی میں چلا جاتا اور کبھی کسی جنگل یا پہاڑ کی طرف نکل جاتا۔ ۱۹۴۵ میں لاہور کا سفر بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھا۔ اس وقت پاسپورٹ اور ویزا کے مسائل نہیں تھے۔ میں شاہ گنج میں ایک اکسپریس ٹرین پر سوار ہوگیا۔ اس وقت شاہ گنج سے لاہور کا ریلوے کرایہ غالباً گیارہ روپئے تھا۔ ٹرین نے سیدھا لے جاکر مجھے لاہور میں اتار دیا۔

لاہور اسٹیشن پر اترنے والے تمام مسافر اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ مگر میں دیوانگی کے عالم میں کھڑا ہوا سوچ رہا تھا کہ کہاں جاؤں۔ کیوں کہ اس وقت لاہور میں کوئی بھی میرا جاننے والا نہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب پلیٹ فارم خالی ہوگیا تو ایک خالی انجن دھواں اڑاتا ہوا پٹری سے گزرا۔ میں اس کی طرف بڑھا کہ اپنے آپ کو اس کے نیچے ڈال دوں۔ مگر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی مخفی طاقت نے میرے قدموں کو پکڑ لیا ہے۔ چاہنے کے باوجود میں آخری اقدام سے باز رہا۔

میں ریلوے اسٹیشن کے باہر آیا۔ میں اسٹیشن کی عقبی سڑک پر کھڑا تھا۔ لوگ اِدھر سے اُدھر آتے جاتے نظر آرہے تھے۔ "یہ لوگ کیا کرتے ہیں اور کہاں جارہے ہیں" میرے دل نے سوال کیا۔ اتنے میں ایک کم عمر خوش پوشش آدمی ایک طرف سے دوسری طرف جاتا ہوا دکھائی دیا۔ میں بڑھ کر اس کے پاس پہنچا۔ سلام علیک کے بعد میں نے پوچھا:

آپ کیا کام کرتے ہیں۔

میں کسی بنک میں کام کرتا ہوں۔

آدمی نے مختصر جواب دیا اور پھر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ آدمی کسی بنک میں کلرک تھا۔ مگر اس نے ایسے پر اعتماد لہجہ میں جواب دیا جیسے کہ اس کو کوئی بہت بڑی چیز مل ہوئی ہو —— جو شخص کم پر راضی ہو جائے اس کو کبھی زیادہ نہیں ملتا۔

انگریزی دور میں یہاں کے ایک صاحب خواجہ محمد بخش مزدور کی حیثیت سے آسٹریلیا گئے تھے۔ وہ واپس آتے تو لوگ ان کو محمد بخش آسٹریلیا کہتے تھے۔ ۱۹۲۵ میں انھوں نے ریلوے اسٹیشن کے

پاس ایک مسجد بنائی جوان کے نام پر آسٹریلیا مسجد (جامع آسٹریلیا) مشہور ہوگئی۔

میں ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلا تو یہی مسجد میرے سامنے تھی۔ چنانچہ میں نے آسٹریلیا مسجد میں اپنا مختصر سامان رکھا اور ایک اجنبی مسافر کی حیثیت سے شہر میں داخل ہوا۔ میں کسی منصوبہ اور معلومات کے بغیر مختلف سڑکوں پر گھومتا رہا۔ یہاں تک کہ میں میورو ڈ پہنچ گیا۔ یہاں سڑک کے کنارے ایک چھوٹے سے بورڈ نے بتایا کہ یہ ڈاکٹر اقبال (۱۹۳۸ - ۱۸۷۷) کا مکان ہے۔ مکان بالکل اجاڑ دکھائی دے رہا تھا۔ میں وہاں ٹھہر گیا۔ سڑک سنسان تھی۔ میں بجلی کے ایک کھمبے کے نیچے اکیلا کھڑا تھا۔ میری آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے اور میری زبان پر یہ الفاظ جاری تھے:

خداوند تو کب آئے گا۔ میں کب تک تیرے آنے کا انتظار کروں

یہ دعائیہ کلمہ میری اس آتشیں کیفیت کو بتا رہا ہے جس کے تحت میں اس زمانہ میں لاہور گیا اور دوسرے مقامات کے سفر کئے۔

طبیعت کچھ تھمی تو مجھ کو پیاس کا احساس ہوا۔ اقبال کے مکان سے ملی ہوئی سڑک کے کنارے ایک چھوٹی سی معمولی طور پر بنی ہوئی مسجد دکھائی دی۔ میں وہاں پہنچا۔ دیکھا تو ایک ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا۔ میں ہینڈ پمپ چلانے لگا۔ مگر دیر تک چلانے کے بعد بھی پانی نہیں نکل رہا تھا۔ اتنے میں ایک شخص سڑک سے گزرا۔ وہ میری حالت کو محسوس کر کے میری مدد کے لئے آیا۔ اس نے غور سے دیکھا اور پھر بتایا کہ پانی برابر آرہا ہے مگر باہر کی ٹونٹی بند ہے اس لئے سارا پانی پچھلے پائپ سے گزر کر حوض میں چلا جاتا ہے۔ اس نے ٹونٹی کھولی تو فوراً میرے سامنے پانی گرنے لگا۔

یہ میری زندگی کا پہلا "تعمیری" سبق تھا۔ اس واقعہ نے مجھے بتایا کہ اس دنیا میں صرف عمل کافی نہیں۔ عمل کے نتیجہ خیز بننے کے لئے دوسرے بہت سے اسباب کی موافقت بھی ضروری ہے۔ اگر کوئی ایک ضروری سبب بھی موافقت نہ کر رہا ہو تو سارے عمل کے باوجود کوئی نتیجہ حاصل نہ ہوگا۔

یہ آدمی جس نے میری مدد کی اس کا پورا نام اب یاد نہیں رہا۔ صرف یہ یاد ہے کہ اس کے نام کے آگے قریشی کا لفظ شامل تھا۔ پانی پینے کے بعد قریشی صاحب مجھے اپنے چھوٹے سے مکان پر لے گئے۔ اس کے بعد بقیہ ایام میں نے انھیں کے ساتھ گزارے۔

اس وقت لاہور کی مال روڈ (موجودہ شاہراہ قائد اعظم) پر ٹیلرنگ کی ایک بڑی دکان تھی جس کا نام بی لیلارام اینڈ سنز تھا۔ یہاں کے ٹیلر ماسٹر ایک مسلمان تھے۔ قریشی صاحب نے مجھ کو ان ٹیلر صاحب سے ملایا۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے کہا "یہ کسی اچھے خاندان کا لڑکا ہے اور غلطی سے یہاں آگیا ہے۔" انھوں نے اصرار کر کے مجھے واپسی پر آمادہ کیا۔ دو ہفتے کے بعد انھوں نے ٹکٹ خرید کر مجھے ٹرین پر بٹھا دیا اور میں اپنے وطن اعظم گڈھ واپس آگیا۔ جہاں تک یاد ہے واپسی ٹکٹ کا کرایہ میرے پاس نہیں تھا۔ وطن واپس آنے کے بعد میں نے منی آرڈر کے ذریعہ ٹیلر صاحب کی رقم انھیں بھیج دی۔

۲۷ مارچ ۱۹۸۵ کو میں نے دوبارہ میوروڈ جا کر اسے دیکھا "جاوید منزل" اب "علامہ اقبال میوزیم" بن چکا ہے۔ مکان کا تعمیری نقشہ وہی پرانا ہے۔ البتہ اس کو از سر نو مزین کیا گیا ہے۔ ایک تختی پر علامہ اقبال کے مختصر حالات لکھے ہوئے تھے۔ اس میں یہ فقرہ بھی تھا:

۱۹۳۰ میں الٰہ آباد کے مقام پر اپنے تاریخی خطبہ میں اس مسلم ریاست کا تصور پیش کیا جو اب پاکستان کی صورت میں قائم ہے۔

جاوید منزل سے ملی ہوئی چھوٹی سی مسجد رقبہ کے اعتبار سے اب بھی اتنی ہی بڑی ہے۔ البتہ اس کو دوبارہ دو منزلہ صورت میں تعمیر کیا گیا ہے۔

میوروڈ تعمیری لحاظ سے اب بھی تقریباً ویسا ہی نظر آیا جیسا کہ وہ ۴۰ سال پہلے تھا۔ اس فرق کے ساتھ کہ اب یہاں انسان زیادہ نظر آنے لگے ہیں۔ جب کہ ۱۹۴۵ میں وہ ایک سنسان سڑک کی مانند تھی۔

ریلوے اسٹیشن بھی معمولی اضافہ کے ساتھ تقریباً ویسا ہی ہے جیسا کہ وہ ۱۹۴۵ میں تھا۔ کوئی بڑی تبدیلی مجھے وہاں دکھائی نہیں دی۔

دوسرا سفر

لاہور کے لئے میرا دوسرا سفر فیروز پور کے راستہ سے مئی۔ جون ۱۹۷۱ میں ہوا۔ ۱۹۴۵ میں میں نے جو سفر کیا وہ ایک ہی ملک کے ایک حصہ سے اس کے دوسرے حصہ میں جانا تھا۔ اس وقت کسی "سرحد" کا وجود نہ تھا جہاں چیکنگ کی ضرورت پیش آئے۔ مگر ۱۹۷۱ میں تاریخ بدل

چکی تھی۔ اب میں دہلی سے لاہور کے لئے روانہ ہوا تو میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں جا رہا تھا۔ چنانچہ سرحد پر زبردست چیکنگ کا سامنا کرنا پڑا۔

ہندستانی چوکی پر نہ جاتے ہوئے کوئی خاص زحمت پیش آئی اور نہ آتے ہوئے۔ مگر پاکستانی چوکی پر ایسی سخت پریشانی پیش آئی کہ میں نے سوچا کہ میرے جیسے آدمی کو پاکستان جانا ہی نہیں چاہئے۔

واپسی میں پاکستانی چوکی پر متعین آدمی کا ظالمانہ رویہ اپنی آخری حد کو پہنچ گیا۔ میں جون کی تیز دھوپ میں کھلے میدان میں کھڑا ہوا تھا۔ خدا اور اسلام کا کوئی بھی حوالہ اس آدمی کے لئے بے اثر ثابت ہو رہا تھا۔ جو میری تمام کتابیں اور اوراق بکھیر کر میز کی دوسری طرف مجھے اس طرح فاتحانہ انداز میں دیکھ رہا تھا کہ میں کوئی مجرم ہوں۔ اس کا کھلا مطالبہ تھا کہ جو کچھ پیسہ تمہارے پاس ہے وہ سب ہمارے حوالے کرو۔ ورنہ ہم جانے نہیں دیں گے۔

میں بے بس کھڑا ہوا تھا کہ اچانک ایک تدبیر میرے ذہن میں آئی۔ جاتے ہوئے میں نے دیکھا تھا کہ پاکستان کی سمت میں ایک خیمہ لگا ہوا ہے جس میں ایک فوجی افسر ڈیوٹی پر رہتا ہے۔ جاتے ہوئے اتفاقاً میری اس سے کچھ بات چیت ہو گئی تھی۔ جب میں نے دیکھا کہ تفتیش کا آدمی مجھ کو چھوڑ نہیں رہا ہے تو میں نے کہا "یہ میجر صاحب مجھ کو جانتے ہیں کہئے تو ان کو بلا دوں" اس جملہ نے جادو کا کام کیا اس کو سنتے ہی فی الفور آدمی کا رویہ بدل گیا۔ اس نے میرے بیگ سے ایک سادہ ڈائری نکالی اور کہا کہ جائیے۔

کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو خدا سے اتنا بھی نہیں ڈرتے جتنا وہ ایک فوجی افسر سے ڈرتے ہیں۔

لاہور پہنچ کر میں آٹو رکشا کے ذریعہ مولانا امین احسن اصلاحی کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ قریب پہنچ کر ڈرائیور نے کچھ لوگوں سے پوچھا "امین احسن اصلاحی کا گھر کون سا ہے" مگر لوگ سمجھ نہ سکے۔ کسی نے کہا "امین احسن مودودی" کسی نے کہا "ابوالاعلیٰ اصلاحی"۔ لوگ نہ پوری طرح مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو جانتے تھے اور نہ پوری طرح مولانا امین احسن اصلاحی کو۔

یہ وہ وقت تھا جب کہ جنرل یحییٰ خاں کی حکومت کے تحت ابھی حال میں جماعت اسلامی پاکستان

نے الکشن میں ناکام حصہ لیا تھا۔ لاہور کی دیواروں پر اب بھی ایسے پوسٹر لگے ہوئے تھے جو اگرچہ پھٹ چکے تھے۔ تاہم ان پر جلی حرفوں میں یہ الفاظ لکھے ہوئے پڑھے جاتے تھے :

انشاء اللہ جیتے گی ، جماعت اسلامی جیتے گی۔

جدید اسلامی تاریخ کا یہ ایک عجوبہ ہے کہ وہ لوگ جن کا تعارف ملک کے صرف ۵ فی صد تعلیم یافتہ طبقہ میں ہے وہ الکشنی سیاست میں کودتے ہیں جہاں جاہل عوام کی اکثریت کی رائے فیصلہ کن ہوتی ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ بڑا عجوبہ یہ ہے کہ ان کا یہ بے معنی اقدام جب انھیں ناکامی سے دوچار کرتا ہے تو وہ فوراً یہ شور کرنے لگتے ہیں کہ الکشن میں دھاندلی ہوئی ہے۔ ان کے اندر نہ اتنی عقل ہے کہ سیاسی معاملات کو سمجھیں اور نہ اتنا حوصلہ ہے کہ اپنی شکست کا اعتراف کریں۔

لاہور میں میری ملاقات خاص طور پر مولانا مودودی سے ہوئی وہ کافی کمزور ہو چکے تھے چھڑی ٹیک کر بہت آہستہ آہستہ چلتے تھے۔ پہلی ملاقات ان کے مطالعہ کے کمرہ میں ہوئی۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ ان کا مطالعہ کا کمرہ ایک ایسا کمرہ ہے جہاں روشنی صرف بجلی کے بلب کے ذریعہ حاصل کی جا سکتی ہے۔ راقم الحروف کا ذوق اس معاملہ میں یکسر مختلف ہے۔ میں لکھنے پڑھنے کا کام ایسے کمرہ میں کرنا پسند کرتا ہوں جہاں سورج کی روشنی پوری طرح آتی ہو۔ اس میں صرف رات کا استثنا ہے۔ کیوں کہ رات کے وقت مصنوعی روشنی ایک ضرورت بن جاتی ہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے ملاقات ہوئی تو ان کو میں نے الجمعیۃ دیکلی کا ایک شمارہ (۲۷ نومبر ۱۹۷) پیش کیا۔ اس کو لیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ " میں اس کو پڑھوں گا۔ آپ کی کوئی چیز ملتی ہے تو میں ضرور اس کو پڑھتا ہوں"۔

الجمعیۃ کے اس شمارہ میں ایک مضمون تھا جس میں مسلم ممالک میں اسلامی احیاء کے امکانات پر گفتگو تھی۔ اگلی ملاقات میں اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا مودودی نے کہا " آپ جیسے لوگ مسلم ممالک کے بارہ میں کافی خوش فہم رہتے ہیں۔ حالانکہ موجودہ مسلم ممالک میں اسلامی کام کے مواقع اس سے بھی کم ہیں جتنا غیر مسلم ممالک میں ہیں"۔

میں نے کہا کہ اس کی وجہ اسلامی تحریکوں کی یہ نادانی ہے کہ وہ ملے ہوئے مواقع کا بیجا استعمال کرتی ہیں۔ مسلم ممالک کی موجودہ اسلامی تحریکوں نے اسلام کا ایسا تعارف کرایا ہے گویا کہ اسلام

حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی ایک تحریک ہے۔ اس بنا پر حکمراں طبقہ ان کا مخالف ہو گیا ہے۔ اگر وہ سیاسی ٹکراؤ سے بچ کر کام کریں تو حکمراں طبقہ ان کا تعاون کرے۔ اور زبردست کام ہونے لگے۔

واپسی کے بعد میں نے اپنی کتاب الاسلام کا دوسرا اڈیشن دستی طور پر مولانا مودودی کے لئے بھجوایا تھا۔ یہ کتاب ان کو پہنچ گئی تھی اور اس کے ملنے کی اطلاع بھی مولانا مودودی کے دستخط سے مجھے بذریعہ ڈاک وصول ہو گئی تھی۔ اس خط پر ۱۱ فروری ۱۹۷۰ کی تاریخ درج ہے اور حسب ذیل الفاظ لکھے ہوئے ہیں:

محترمی و مکرمی سلام مسنون

آپ کی ارسال کردہ کتاب "الاسلام" مجھے مل گئی ہے۔ میں اس عنایت کے لئے آپ کا شکرگزار ہوں۔

خاکسار ابوالاعلیٰ

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے لاہور کی ملاقات میں سب سے زیادہ دلچسپی اس سے ظاہر کی کہ اخبار مسلم (دہلی) اور اخبار الجمعیۃ (دہلی) کے وہ قدیم شمارے انھیں حاصل ہو سکیں جو کہ ان کی ادارت میں شائع ہوئے تھے۔ ان کی فرمائش کے مطابق ہندستان واپس آکر میں نے الجمعیۃ ویکلی میں اس کا اعلان شائع کیا تھا مگر وہ شمارے حاصل نہ ہو سکے۔ الجمعیۃ ویکلی ۲ جولائی ۱۹۷۱ صفحہ ۳ پر ایک چوکھٹے میں یہ اشتہار دیکھا جا سکتا ہے:

مندرجہ ذیل قدیم پرچے بقیمت درکار ہیں:

اخبار مسلم ۱۹۲۲ تا ۱۹۲۳

اخبار الجمعیۃ دسمبر ۱۹۲۴ تا دسمبر ۱۹۲۸

جن صاحب کے پاس مذکورہ فائل برائے فروخت موجود ہو وہ مطلع فرمائیں اور مطلوبہ قیمت بھی تحریر کریں۔

یہ اعلان مولانا مودودی ہی کی فرمائش پر کیا گیا تھا۔ اگرچہ عملاً مذکورہ پرچے دستیاب نہ ہو سکے۔

مولانا مودودی پہلے دن زیادہ تر اخبار مسلم اور اخبار الجمعیۃ کے مذکورہ فائل کے بارہ میں

بات کرتے رہے۔ وہ اگرچہ نہایت کمزور اور مریض تھے، تاہم انھوں نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کافی دلچسپی کا اظہار کیا۔

ملاقات سے پہلے مولانا مودودی کے رفیق خاص (غالباً رحمت الٰہی صاحب) نے کہا تھا کہ مولانا کی طبیعت بہت ناساز ہے۔ اس لئے ان سے کوئی اختلافی بات نہ چھیڑی جائے۔ وہ ملاقات کے وقت برابر میرے پاس بیٹھے رہے۔ جب میں باہر نکلا تو میں نے مذکورہ رفیق سے کہا کہ میں بعض امور پر بات کرنا چاہتا تھا مگر وہ نہ ہو سکی۔ انھوں نے دوبارہ وہی بات کہی کہ موجودہ حالت میں اختلافی امور پر بات کرنا مناسب نہیں ہے۔ کافی اصرار کے بعد وہ اس پر راضی ہوئے کہ میں جو بات کرنا چاہتا ہوں اس کا خلاصہ پیشگی طور پر لکھ کر انھیں دے دوں۔

میں نے وہیں بیٹھ کر ایک کاغذ پر چند سطریں لکھیں۔ اس تحریر کی نقل میرے پاس محفوظ نہیں۔ مفہوم کے اعتبار سے وہ بات یہ تھی کہ ــــــ پاکستان اسلام کے نام پر بنا۔ اس سے آپ نے قیاس کیا کہ پاکستان کے لئے مسلم لیگ نے جو مومنٹم پیدا کیا تھا اس کو آپ اپنی تحریک کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے پوری طرح اپنی جماعت کو اس رخ پر ڈال دیا۔ مگر آپ کا یہ اندازہ صحیح نہیں۔ تاریخی اور عقلی طور پر ایسا ہونا ناممکن ہے کہ کسی کی پیدا کردہ حرکت کو کوئی دوسرا شخص اپنے حق میں استعمال کر سکے۔ اس قسم کی کوشش کا انجام ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس لئے آپ کے لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ الکشن اور مطالبۂ نظام اسلامی جیسی سیاست کو چھوڑ کر دوبارہ وہی اصلاحی اور تدریجی انداز اختیار کریں جس پر آپ تقسیم سے پہلے عامل تھے۔

میری یہ تحریر مولانا مودودی کے حوالے کر دی گئی۔ اور میں یہ کہہ کر واپس آگیا کہ کل میں دوبارہ ملاقات کروں گا اور اس موضوع پر براہ راست گفتگو کروں گا۔ اگلے دن میں عصر کی نماز کے وقت اچھرہ (۵۔ اے ذیل دار پارک) پہنچا تو پچھلے دن کے برعکس مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا چہرہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ وہ سخت برہم نظر آتے تھے۔ میں نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے رفیق خاص کے مشورہ پر عمل کیا اور مولانا کی ناسازیٔ طبع کی بنا پر اختلافی مسئلہ پر گفتگو کئے بغیر واپس چلا آیا۔ عصر اور مغرب کی نمازیں میں نے ان کے ساتھ اچھرہ میں پڑھیں۔

۱۹۷۱ میں جب میں ہندستان سے پاکستان پہنچا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں دوسرے

درجہ کے ایک ملک میں آگیا ہوں۔ وہاں کی ہر چیز مجھے ہندستان کے مقابلہ میں معمولی نظر آئی۔ وہاں کی ٹرین، وہاں کی بسیں، وہاں کے پارک، وہاں کے مکانات، سب نمایاں طور پر کمتر دکھائی دئے۔ وہاں کے اخبارات کا حال یہ تھا کہ میں نے ایک پاکستانی تعلیم یافتہ سے کہا کہ میری سزا کے لئے یہ کافی ہے کہ مجھے کسی مکان میں بند کر کے پابند کر دیا جائے کہ تم پاکستان کے اخبارات پڑھتے رہو۔ معمولی معمولی چیزیں مثلاً دروازہ کے بولٹ اور قلم کی سیاہی بھی چین کی بنی ہوئی نظر آئی۔

تاہم ۱۹۸۵ کے سفر میں محسوس ہوا کہ پچھلے پندرہ سال میں پاکستان نے کافی ترقی کی ہے۔ ہر شعبہ میں پہلے کے مقابلہ میں زیادہ بہتر حالات نظر آئے۔

۱۹۷۱ کے سفر کی یادوں میں سے ایک یاد یہ ہے کہ ایک روز رات کا وقت تھا۔ میں اپنے میزبان کے ساتھ ان کے دو منزلہ مکان کی چھت پر کھڑا ہوا تھا۔ چاند کی چاندنی پوری آب و تاب کے ساتھ فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہم دونوں خاموش قدرت کے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ اچانک میرے میزبان نے گہرے تاثر کے انداز میں کہا:

"یہی چاند تو ہندستان میں بھی چمکتا ہوگا"

کیسی عجیب ہے وہ دنیا جہاں چاند کو ایک ملک سے لے کر دوسرے ملک تک چمکنے کی اجازت ہو مگر انسان کے لئے حد بندیاں کھڑی ہوئی ہوں۔ چڑیاں آزادانہ طور پر ایک طرف سے دوسری طرف اڑ رہی ہوں مگر انسان ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ میں جانا چاہے تو بے رحم سرحدی قوانین وہاں اس کا استقبال کرنے کے لئے موجود ہوں۔ کتنا خوش قسمت ہے چاند، اور کتنا بد قسمت ہے انسان۔

آسٹریلیا کو چھوڑ کر تمام براعظموں (ایشیا، یورپ، افریقہ، امریکہ) ہر جگہ مجھے جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ جب بھی میں کسی دوسرے ملک میں گیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں ہندستان سے مختلف ایک ملک میں آیا ہوں۔ مگر ہندستان سے پاکستان جانا گویا ہندستان سے ہندستان میں جانا ہے۔ دونوں ملکوں میں اتنی زیادہ مشابہت ہے کہ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ آدمی ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچ گیا ہے۔ اس کے باوجود ہندستان اور پاکستان کے ایئر پورٹ پر دونوں ملکوں کے مسافروں کی جتنی تفتیش کی جاتی ہے اتنی تفتیش شاید کسی بھی دوسرے ملک میں آنے جانے والوں کی نہیں کی جاتی۔

۱. بنگلور میں تبلیغی جماعت کا اجتماع ۲۳-۲۵ فروری ۱۹۸۵ء کو ہوا۔ اس موقع پر الرسالہ اور اس کی مطبوعات کا اسٹال لگایا گیا۔ خدا کے فضل سے اسٹال کامیاب رہا۔ کافی لوگوں نے کتابیں دیکھیں اور خرید کر اپنے ساتھ لے گئے۔ ایک تعلیم یافتہ صاحب اسٹال پر آئے۔ وہ الرسالہ کے مشن سے پہلے سے واقف تھے۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ میرے گھر والوں کی غذا ہے۔ پھر انھوں نے حاضرین کو مخاطب کرکے کہا —— "یہ کتابیں میں نے پڑھی ہیں۔ یہ کتابیں بندہ کو خدا سے ملانے والی ہیں۔ جو شخص بھی اپنا تعلق خدا سے جوڑنا چاہتا ہے اس کو یہ کتابیں ضرور پڑھنا چاہئے۔ میں اپنے بارہ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں نے ان کتابوں کے ذریعہ حقیقی معنوں میں خدا کو پایا ہے۔

۲. ۳۱ مارچ ۱۹۸۵ کی شام کو مرکز میں ماہانہ درس قرآن کا اجتماع ہوا۔ یہ اجتماع ہر مہینہ کی آخری اتوار کو نماز مغرب کے بعد ہوتا ہے۔ اس بار اخبار قومی آواز میں اس کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ حاضرین کی تعداد غیر معمولی طور پر زیادہ تھی۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر جو درس دیا اس کا ٹیپ مرکز میں محفوظ ہے۔

۳. اسلامی مرکز اب خدا کے فضل سے اس حد تک معروف ہو چکا ہے کہ اس کا تذکرہ عالمی خبروں میں جگہ پانے لگا ہے۔ مثال کے طور پر الرسالہ کے ایک بیرونی قاری کا خط (۲۹ اپریل ۱۹۸۵) ہمیں موصول ہوا ہے۔ مکتوب نگار نے اپنے خط میں جو باتیں لکھی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے:

> Abdus Salam was listening to a Kuwaiti radio station the other day. They mentioned Maulana's book: الاسلام يتحدى
> during one of their talks: كما قال وحيد الدين خان في كتابه
> It seems that this book is very well known in the Arab world.

۴. ۱۲ اپریل ۱۹۸۵ کی شام کو گول مارکٹ (نئی دہلی) میں ایک اجتماع ہوا۔ صدر اسلامی مرکز نے اس موقع پر تعلیم یافتہ اصحاب کے سامنے ملی مسائل پر اظہار خیال کیا۔ ان کی گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے یہاں جو دے وہی پاتا ہے، جو نہ دے اسے کچھ نہیں ملتا۔ یہ تقریر آدھ گھنٹہ کی تھی۔ اس کا ٹیپ لے لیا گیا ہے جو مرکز میں محفوظ ہے۔

۵. مدرسہ مصباح العلوم (آسنسول) کی فرمائش پر صدر اسلامی مرکز نے ان کے سوونیر کے لئے

ایک "پیغام" بھیجا تھا۔ یہ پیغام اسی عنوان سے الرسالہ کی زیر نظر اشاعت (جون ۱۹۸۵) میں شامل ہے۔

۶. اللہ کے فضل سے کیسٹ میگزین کا اجرا ہو چکا ہے۔ یکم جون ۱۹۸۵ سے اس کی باقاعدہ روانگی شروع ہو رہی ہے۔ ابتدائی رپورٹ کے مطابق اس سلسلہ کو کافی پسند کیا جا رہا ہے۔

۷. پچھلی ڈاک سے مرکز کو ایک پیکٹ ملا۔ اس میں "مذہب اور جدید چیلنج" کا انڈونیشی ترجمہ تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انڈونیشی زبان میں بھی اس کتاب کا ترجمہ شائع ہو گیا ہے۔ ترکی اور عربی اور کئی دوسری زبانوں میں اس کے ترجمے پہلے ہی شائع ہو چکے ہیں۔

۸. ہندی ترجمہ کے لئے ہمیں ایک لائق اور اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص کی خدمات حاصل ہو گئی ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی ہندی زبان میں مرکز کی مطبوعات کے ترجمے شائع کئے جائیں گے

۹. مولانا آزاد تعلیمی مرکز (اسرہٹہ ضلع جونپور) میں ۲۵-۲۶ اپریل ۱۹۸۵ کو ایک دو روزہ پروگرام رکھا گیا۔ اس میں صدر اسلامی مرکز کی دو تقریریں اور ایک درس قرآن تھا۔ تعلیمی مرکز کے اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ اطراف کی بستیوں سے تعلیم یافتہ اور باشعور افراد ان پروگراموں میں شریک رہے۔ اس موقع پر الرسالہ اور مطبوعات کا بک اسٹال بھی لگایا گیا۔ لوگوں نے کتابیں حاصل کیں اور الرسالہ کی خریداری قبول کی۔

۱۰. ۲۸ اپریل ۱۹۸۵ کی شام کو مہینہ کے آخری اتوار کا درس قرآن ہوا۔ اس بار انگریزی اخبارات میں بھی اس کا اعلان شائع کیا گیا تھا۔ ہندستان ٹائمس (۲۸ اپریل ۱۹۸۵) نے اپنے مستقل کالم (What's on) میں اس کو پہلی خبر کے طور پر حسب ذیل الفاظ میں شائع کیا تھا:

THE ISLAMIC CENTRE: Maulana Wahiduddin Khan to speak on the meanings of the Qur'an; C-29, Nizamuddin West; 7 p.m.

۱۱. اسلامی مرکز کی کچھ کتابیں عرصہ سے ختم تھیں وہ دوبارہ چھپ کر آگئی ہیں۔ کچھ نئی کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ نئی شائع شدہ کتابوں کے نام یہ ہیں، تذکیر القرآن پندرہ پارے، اسلامی زندگی، تبلیغی تحریک، سوشلزم اور اسلام۔ حل یہاں ہے (مع اضافہ)۔ دین کی سیاسی تعبیر صراط مستقیم۔ ان کے علاوہ ایک اور کتاب زیر طبع ہے "عظمت قرآن"

ایک گزارش

اسلامی مرکز کی ابتدا ۱۹۷۰ میں ہوئی۔ پچھلے پندرہ سال کے عرصے وہ نہایت خاموشی کے ساتھ دعوت الی اللہ اور تعمیر ملت کے کام میں مصروف ہے۔ اردو اور انگریزی میں ماہنامہ الرسالہ جاری ہے اور ہندی اور دوسری زبانوں میں اس کے اجرار کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ مکتبہ الرسالہ کے تحت کئی درجن کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے ذرائع دعوت کو بھی حسب حالات استعمال کیا جا رہا ہے۔

کام میں اضافہ کے ساتھ بہت سی نئی ضرورتیں بھی سامنے آگئی ہیں۔ مثلاً پرنٹنگ پریس کا قیام دار الترجمہ، تعلیمی و تربیتی درس گاہ، دوسری ملکی زبانوں میں الرسالہ کا اجرار اور کتابوں کی اشاعت، مختلف مقامات پر فارغ کارکن مقرر کرنا وغیرہ

موجودہ کام کو چلانے اور دوسرے منصوبوں کو بروئے کار لانے کے لئے کثیر وسائل کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں ہم آپ سے مالی تعاون کی اپیل کرتے ہیں۔

رقم بھیجتے وقت یہ ضرور صراحت فرما دیں کہ وہ کس مد کی رقم ہے۔

وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

سی ۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۳

الرسالہ مفت

آپ الرسالہ مفت پڑھ سکتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ آپ ایک بار ۳۶ روپئے جمع کر کے الرسالہ کے سالانہ خریدار بن جائیں۔ اس کے بعد الرسالہ کے جو شمارے آپ کو پہنچیں ان کو پڑھنے کے بعد صفائی کے ساتھ محفوظ کرتے رہیں۔ جب بارہ پرچے اکٹھا ہو جائیں تو ہم کو واپس بھیج دیں۔ یہ بارہ شمارے آپ کی طرف سے ۳۶ روپے شمار ہوں گے۔ ان کے عوض دوبارہ اگلے سال آپ کے نام الرسالہ جاری کر دیا جائے گا۔ اسی طرح آئندہ سالوں میں بھی برابر کرتے رہیں اور الرسالہ آپ کو برابر پہنچتا رہے گا

منیجر الرسالہ

نئی مطبوعات

تذکیر القرآن (جلد اوّل) سورہ توبہ ۔ بنی اسرائیل	صفحہ ۸۰۰
اسلامی زندگی	۱۶۰
سوشلزم اور اسلام	۲۰۸
صراط مستقیم	۲۰۰
تبلیغی تحریک	۹۶
دین کی سیاسی تعبیر	۷۲

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔

الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارنبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱. الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲. زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

۳. کم تعداد کی ایجنسی کے لئے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴. صاحب استطاعت افراد کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵. ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپواکر دفتر الرسالہ سی۔۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

الرسالہ
کیسٹ

الرسالہ کیسٹ کی روانگی انشاء اللہ یکم جولائی سے شروع ہوگی
انفرادی خریدار اطلاع بھیج کر جلد اپنی خریداری درج کرادیں۔
جو حضرات اس کی ایجنسی لینا چاہیں
وہ بھی اپنی مطلوبہ تعداد سے مطلع فرمائیں۔
الرسالہ کیسٹ کی ایجنسی کم از کم پانچ کیسٹوں پر دی جائے گی۔

کمیشن :

۲۵ کیسٹ تک — ۲۰ فی صد

۲۵ کیسٹ سے زیادہ — ۲۵ فی صد

(ہدیہ فی کیسٹ ۲۵ روپیہ)

الرسالہ کیسٹ

سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

Regd. No. D(SE) 243
Regd. R.N. No. 28822/76

June 1985
Number 103

AL-RISALA MONTHLY

C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110 013 Tel. 611128